U32725. Date 30-12-03

Title - NAZR-E-DAKAN ; DAKAN KE MUTALLUQ KHAWATEEN DAKAN KE RASHHAAT QALAM

Creator - Sakeena Begum.

Publisher - Anhad Afreen Barqi Press (Hyderabad)

Date - 1929

Pages - 104.

Subjects - Tazkira - Dakan ; Sikke - Salateen Bahaman ; Maskookaat ; Dakan - Tareekh-o-Tehzeeb ;

سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیات اردو شمارہ (۲۰)

نذرِ دکن

دکن کے متعلق خواتین دکن کے رشحاتِ قلم

مرتبہ

سکینہ بیگم

داعی شعبۂ نسواں و مدیرۂ سب رس

رفیق ادارۂ ادبیات اردو

قیمت ۱۴/ عصہ

بار اول

جنوری ۱۹۳۹ء

مطبوعہ عہد آفریں برقی پریس حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اردو کی دوسری مطبوعات

۱ - مرقع سخن (جلد اوّل)
۲ - مرقع سخن (جلد دوم)
۳ - سراج سخن
۴ - ایمان سخن
۵ - فیض سخن
۶ - بادۂ سخن
۷ - کیف سخن
۸ - متاع سخن
۹ - ورڈزورتھ اور اس کی شاعری
۱۰ - ٹیگور اور اُن کی شاعری
۱۱ - یوسف ہندی قید فرنگ میں
۱۲ - ہوش کے ناخن (ڈراما)
۱۳ - نذر ولی
۱۴ - نقد سخن
۱۵ - گریہ و تبسّم
۱۶ - مشاہیر قندھار دکن
۱۷ - من کی دنیا
۱۸ - مدراس میں اردو

فہرست

تصاویر

مضامین



ملکہ چاند سلطانہ

پیش کش

"سب رس" نئے سال کے ساتھ نئے ساز و سامان سے اپنے قدردانوں کی خدمت میں حاضر ہے۔ اس کا جنوری نمبر "مرقع دکن" بنا ہوا شرف ملاحظہ حاصل کر چکا ہے، اب سب رس کا خواتین نمبر "نذر دکن" کے نام سے ہدیۂ ناظرین ہے۔

نذر دکن قارئین کے ملاحظہ میں پیش کرتے ہوئے شعبۂ نسواں کے وجود، اس کی زندگی کے مختصر حالات اور اس کے اغراض و مقاصد کا بیان کرنا ضروری ہے۔

یہ شعبہ زیر سرپرستی ادارہ ادبیات اردو نسوانی دنیا میں علمی و عملی سرگرمی اور خواتین میں اردو علم و ادب کا صحیح، سنجیدہ اور سلجھا ہوا ذوق پیدا کرنے کی غرض سے قائم کیا گیا، اس کے اغراض و مقاصد منظورۂ مجلس انتظامی حسب ذیل ہیں:-

۱۔ تقسیم عمل سے آسانی کار پیدا کرنا۔ ۲۔ مختلف خیال و نقطۂ نظر کی خواتین کا تعاون و مشورہ حاصل کرنا۔
۳۔ ہمدرداں اور رفیقان کار کی توسیع۔ ۴۔ علمی معاملات میں مشورہ کے لئے ایک صاحب الرائے جماعت کی فراہمی۔

شعبہ کی زندگی کا آغاز نومبر ۴۸ء سے ہوا اور اب تک ہم نے کئی اجلاس کئے جن میں مختلف امور پر غور کیا گیا اور کچھ ضروری باتیں طے پائیں جن کی تفصیل "مرقع دکن" میں آپ کی نظر سے گذری ہوگی۔

شعبہ کی مجلس عاملہ پانچ خواتین پر مشتمل ہے جس میں محترمہ سارہ بیگم صاحبہ جیسی قابل صاحب الرائے اور تجربہ کار خاتون، محترمہ لطیف النساء بیگم صاحبہ جیسی حق گو ادیبہ اور محترمہ جہاں بانو بیگم جیسی لائق و فائق انشا پرداز خواتین شامل ہیں۔ ایسی قابل احترام ہستیاں جس مجلس کی زینت ہوں اس کا کیا پوچھنا۔

پھر یہ امر ہمارے لئے کس قدر حوصلہ افزا ہے کہ شعبہ کی مجلس عاملہ کی صدر محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ ہیں جن کی علمی و ادبی قابلیت کا اک زمانہ قائل ہے۔ جن کی راہبری نہ صرف ہماری خوش بختی کی دلیل ہے بلکہ ہماری آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ بھی۔

"نذرِ دکن" یعنی خواتین کے مضامین کا وہ دلکش مجموعہ جو شعبہ کی زندگی کا پہلا عملی ثبوت ہے۔ آج آپ کی تفریحِ طبع کے لئے، اپنی ادا و بڑیوں کے اعتبار سے "صد گلستان نگاہ کا ساماں کئے ہوئے" حاضرِ خدمت ہے۔

ہم خلوصِ دل سے اپنی ان تمام بہنوں کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں جنھوں نے باوجود گوناگوں مصروفیتوں کے اپنی قلمی کاوشوں سے "نذرِ دکن" کے صفحات کو رونق بخشی اور جن کے تعاون نے آج ہمیں اس قابل بنایا کہ ہم "نذرِ دکن" کو کتابی صورت میں پیش کر سکیں۔

اُن بہنوں سے جو اس میں حصہ لینے سے قاصر رہی ہیں ہماری استدعا ہے کہ اپنے مضامین اور خیالات سے سب رس کو وقتاً فوقتاً مزین کرتی رہیں۔

مجلس خواتین کی فلاح و بہبود سے متعلق مضامین کی خاص طور پر ضرورت ہے جن بہنوں کو اس سے دلچسپی ہو وہ براہ کرم اپنے مضامین دفتر سب رس یا میرے پتے پر روانہ کریں جو نہایت ممنونیت کے ساتھ شائع کئے جائیں گے۔ دیگر مضامین، کہانیاں اور تاریخی افسانے یا قصے مفید اور نصیحت آمیز نظمیں وغیرہ بھی بھجوائی جائیں نیز امورِ خانہ داری اور حفظانِ صحت پر مفید مضامین بھی شکریہ کے ساتھ قبول کئے جائیں گے۔ بہرحال آپ کی نظرِ عنایت کی ضرورت ہے۔

احسان فراموشی ہوگی اگر اس موقع پر ہم اپنے کرم فرما ڈاکٹر زور صاحب کے خدمات، اُن کی پُرخلوص و بے لوث علمی جدوجہد، اور خاص کر ہماری صنف کے ساتھ اُن کی ہمدردی و دلچسپی کا اعتراف نہ کریں۔ ہم تہہ دل سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں اپنی مخلصانہ مبارکباد اور ہدیۂ تحسین و تشکر پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر زور صاحب کا نام علمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں لیکن نسوانی دنیا میں آپ کا نام حامیان نسوان کی فہرست میں بخط جلی اور بحروف زرین لکھنے کے قابل ہے۔

یہ تمام تر آپ ہی کی محنت اور حوصلہ افزائی کا نتیجہ ہے کہ آج ہم اپنے پہلے علمی کارنامہ کو شایع کر رہے ہیں۔ شعبۂ نسوان کا وجود بھی آپ ہی کا رہین منت ہے آپ نہ صرف اس شعبہ میں دلچسپی لیتے ہیں بلکہ اپنے جذبۂ عمل سے دوسروں کو بھی متاثر کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج مجھ جیسی گمنام و نااہل کا نام تذکرۂ دکن کے پیش کش کے ساتھ نظر آرہا ہے۔

نیا سال اپنے ساتھ نئے نئے خیالات اور نئی نئی امنگیں لئے ہوئے ہے۔ ہم سب ہی بہنوں کی خدمت میں نئے سال کی مبارکباد دیتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ یہ سال سب کے لئے خیر و برکت اور حصول مقاصد کے اعتبار سے آپ اپنی نظیر ہو۔ ہمارے دل جذبۂ خدمت سے سرشار اور ہمارے دماغ علم کی خوشبو سے معطر ہوں، ہم میں خلوص، سچائی اور بے غرضی، بے لاگ کام کرنے کا مادہ پیدا ہو اور ہم آنے والی نسلوں کے لئے ایثار، خودداری اور وطن پرستی کا ایسا نمونہ چھوڑ جائیں کہ وہ ہمارے نقش قدم پر چلنا اپنا فخر سمجھیں۔

سکینہ بیگم

تہنیت نذرِ دکن

روز افزوں ہے ترقی پہ دکن کا معیار — چشمِ بد دور! کہ بے مثل ہے آج اپنا دیار
ہو مبارک یہ نیا دور ترے لیل و نہار — ہو گئیں اب تو خواتینِ دکن بھی بیدار
دورِ عثمانی میں ، گلزارِ ادب ہے ایسا — روز آتی ہے جہاں نت نئی اک تازہ بہار
ہو چکا ہے ادبی شعبۂ نسواں قائم — جس کا مقصد ہے کہ بن جائے ہر اک گل گلزار
تھا عقیدت کا تقاضا کہ کریں نذرِ دکن — پیش کش ایسا کہ ہو عقدِ ثریا بھی نثار
فکر سرگرمِ تجسس رہی مثلِ غواص — للہ الحمد کہ ہاتھ آگیا دُرِّ شہوار
سعی مشکور ہوئی ، ایک مجلہ نکلا — جس میں ہیں صرف خواتین ہی مضمون نگار
زیبِ قرطاس ہوئے ایسے مضامینِ لطیف — جیسے بے لوث تخیل میں ، نسائی کردار

للہ الحمد ، ہر آں چیز کہ می خواست بشیر
جلوہ گر شد ز پسِ پردہ ، بہ حسنِ تدبیر

بشیر النسا بیگم بشیر

ہمارا نظامِ شریعت

نہ پوچھ! اس کی حقیقت کہ آج کیا ہے دکن؟
وقارِ ہند کا باعث بنا ہوا ہے دکن

کسے نصیب یہ عزت، یہ شانِ خودداری
نظر میں ہر کہہ و مہ کی کھبا ہوا ہے دکن

وہ "کوہِ نور" وہ ہیرے، نہ ہوں بھی تو کیا غم
جواہراتِ ادب سے بھرا ہوا ہے دکن

کیا ہے غیر ممالک سے بے نیاز ہمیں
وہ گیان مان کی گنگا بہا رہا ہے دکن

معاشرت میں، تمدن میں، اور ہر اک فن میں
ترقیوں کے منازل پہ آگیا ہے دکن

یہاں عروج ہے، دولت ہے، امن حاصل ہے
شہنشہانِ سلف کی دلی دعا ہے دکن

یہ فیض ہے شہِ عثمانؑ کی حکمرانی کا
کہ یادِ عظمتِ رفتہ دلا رہا ہے دکن

مسلّمہ ہیں معارف نوازیاں اُس کی
کہ سایہ گسترِ عالم، فلک نما ہے دکن

صفت ہے خاص مساوات اور رواداری
اسی نظامِ شریعت پہ چل رہا ہے دکن

ہے فیضِ عام بلا قیدِ مذہب و ملت!
عدو کی آنکھ کا تارا بنا ہوا ہے دکن

جو "شانتی" ہے یہاں ہند میں نہیں ہے کہیں
کہ ظلّ آصفِ سابع میں پل رہا ہے دکن

رہے الٰہی سلامت دکن کا یہ والی
فروغ جس کی اعانت سے پا رہا ہے دکن

بشیرؔ مجھ کو ہے پیارا، وطن کا ہر ذرّہ
کہ میرے ہر رگ و پے میں بسا ہوا ہے دکن

بشیر النسا بیگم بشیرؔ

دکن میں سلاطینِ اسلام کی آمد

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ دکن میں سلاطینِ اسلام کی آمد سلطان علاء الدین خلجی سے شروع ہوئی۔ خلجی سے پہلے کسی بادشاہِ اسلام نے دکن میں فوج کشی نہیں کی تھی۔ یہی سلمان بادشاہ ہے جس نے دکن کی تسخیر کا ارادہ کیا۔

اس زمانے میں دکن تک پہنچنا نہایت مشکل اور دشوار تھا۔ راستہ نہایت خطرناک تھا۔ اور متعدد دریائیں راستے میں حائل تھیں مگر علاء الدین خلجی ۶۹۲ھ ہجری میں متوکلاً علی اللہ نہایت قلیل فوج کے ساتھ دلّی سے نکلا جنگلوں اور پہاڑوں کو طے کرتا ہوا برق و باد کی طرح دولت آباد پہنچا۔ جو اس وقت دیوگڈھ کہلاتا تھا۔ اور قلعہ کا محاصرہ کرلیا چند روز تک محاصرہ رہا۔ آخر دیوگڈھ کے راجہ دیورائے نے بے شمار زر و جواہر اور اجناس نذر گذرانے اور صوبۂ برار بھی نذر کیا۔ علاء الدین نذرانہ اور پیش کش وصول کرکے دہلی چلا گیا۔ اس کے وکلا ہر سال آیا کرتے تھے اور دکن کے راجاؤں سے خراج و پیش کش وصول کرکے لے جاتے تھے۔ سلطان محمد تغلق شاہ کے زمانہ تک یہی کیفیت رہی۔ رفتہ رفتہ سلاطینِ اسلام کی قوت بڑھتی گئی اور ہندو راجاؤں کا زور و غلبہ کم ہوتا گیا۔

سلطان محمد تغلق شاہ کے زمانہ میں دکن پر پوری طرح مسلمانوں کا تسلط ہوگیا۔ اکثر راجہ مطیع و تابع فرمان ہوئے۔ دکن کے اطراف میں جو بلاد و قصبات تھے ان میں مسلمان سکونت پذیر ہوگئے اور ارکانِ اسلام آزادی سے ادا کرنے لگے۔ اس زمانے میں اکثر بزرگانِ دین اور اولیائے کرام اشاعتِ اسلام کی غرض سے دکن کے بلاد و دیہات میں آئے مثلاً حضرت بابا شرف الدین۔ بابا شہاب الدین خلیفہ حضرت شہاب الدین

سہروردی اور بابا فخر الدین وغیرہ۔

تغلق شاہ کی طرف سے دکن میں تین صوبہ دار تھے۔ ایک برار میں۔ دوسرا دولت آباد میں۔ تیسرا ورنگل میں ۷۲۳ھ میں بادشاہ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دہلی کو ویران کر کے دولت آباد کو دارالسلطنت بنایا جائے۔ چنانچہ باشندگان دلّی دولت آباد پہنچے۔ بادشاہ متلون مزاج تھا۔ چند روز کے بعد اپنی اس حرکت پر نادم ہوا۔ اور فرمان جاری کیا کہ جو چاہے دولت آباد میں رہے، جو چاہے دہلی چلا جائے۔ اکثر لوگ دکن میں رہے اور بعض دہلی واپس گئے۔ اس وقت سے دکن میں اسلامی سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی سلطان محمد تغلق شاہ نے مستقل طور سے دکن کو دارالسلطنت نہیں بنایا کیونکہ قدرت نے یہ سعادت حسن گانگو بہمنی کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ اس شخص نے سارے دکن میں اسلام کا پرچم اڑایا اور یہ علاقہ مسلمانوں کے زیر نگین ہوگیا۔ حسن گانگو بہمنی کے حالات بہت دلچسپ ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انھیں مختصر طور پر یہاں بیان کر دیا جائے۔

طبقات ناصری میں صین الدین بیجاپوری نے لکھا ہے۔ حسن کا باپ جب غور میں فوت ہوگیا۔ تو اس کی والدہ اپنے دونوں فرزندوں حسن شاہ اور علی شاہ کو اپنے ہمراہ لیکر اپنے بھائی ملک ظفر خان صوبہ دار پنجاب و ملتان کے ہاں آئی۔ علی شاہ اور حسن شاہ کی تعلیم و تربیت ظفر خان نے کی۔ علی شاہ کا عالم شباب اور حسن شاہ کا زمانہ طفلی تھا جب ظفر خان مارا گیا تو تمام خاندان میں تفرقہ پڑ گیا۔ جس کو جہاں موقع ملا اپنی گزر اوقات کرنے لگا۔ حسن شاہ کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا تمام ہوگیا۔ فاقہ کی نوبت آئی۔ تلاش معاش کی فکر ہوئی۔ اس وقت حسن شاہ کا عالم شباب تھا لکھنے پڑھنے میں بھی اچھی مہارت رکھتا تھا۔ اس لئے دہلی جانے کا قصد کیا۔ اور کئی دن کے سفر کے بعد صبح کے وقت دہلی پہنچا۔ دریا کے کنارے جمنا کے پانی سے وضو کر کے نماز پڑھی۔ سجدہ میں سر رکھا۔ چونکہ سفر کر کے تھک گیا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس لئے اس حالت میں غنودگی طاری ہوگئی اور طلوع آفتاب تک سوتا رہا۔ حسن شاہ کے چہرے پر آفتاب کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ گانگو برہمن جو بہت بڑا منجم تھا۔ ہنود کی عادت کے موافق

جمنا کے کنارے غسل کے لئے آیا۔ دیکھا کہ ایک جوان سو رہا ہے۔ اور اس کی پیشانی پر ستارۂ اقبال نور بار ہے۔ گانگو پنڈت حسن کے پاس آیا اور اُسے بیدار کر کے نہایت محبت و ہمدردی سے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے آ رہے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ حسن نے جواب دیا۔ درویش ہر کجا کہ شب آمد سرائے اُوست۔ میں غریب خانہ بدوش ہوں۔ گانگو پنڈت نے کہا، آپ ہمارے مہمان ہیں۔ ہمارے گھر چلئے۔ حسن پراگندہ حال تھا۔ اس نے منظور کر لیا۔ گانگو کا شکریہ ادا کر کے اس کے ہمراہ روانہ ہوا۔ گانگو نے اسے اپنے ہاں مہمان رکھا۔ چند روز گزرنے کے بعد حسن نے گانگو سے کہا۔ آپ کے مکان پر بیکار بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا۔ آپ کی مہمانداری اور خاطر و تواضع کا شکرگزار ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ کوئی خدمت ہو تو کر کے اپنا وقت گزاروں۔

گانگو نے کہا، آپ میرے باغ میں جائیے، وہاں مزدور کام کرتے ہیں۔ ان کی نگرانی کیجئے۔ چنانچہ حسن روزانہ صبح کو باغ میں جاتا تمام دن مزدوروں سے کام لیتا۔ شام کو پنڈت کی خدمت میں حاضر ہوتا، اس طرح چند روز گزر گئے۔ ایک دن حسبِ عادت باغ میں گیا۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ یکایک چند مزدور شور و غل کرتے ہوئے اس کے پاس آئے۔ کہا ہَل کا پھل زمین میں پھنس گیا ہے۔ ہر چند کوشش کی لیکن نہیں نکلتا۔ یہ سُن کر حسن خود اُس مقام پر گیا۔ دیکھا۔ ہَل واقعی زمین کے اندر پھنس گیا ہے۔ مزدوروں کو حکم دیا کہ ہل کے اطراف سے زمین کھودو۔ جب زمین کھودی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ ایک آہنی زنجیر میں جو ایک دیگ کے منہ پر آویزاں ہے پھنسا ہوا ہے۔ دیگ زمین سے نکالی گئی۔ اس کا منہ کھول کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ اشرفیوں سے بھری ہوئی ہے۔ حسن نے تمام اشرفیوں کو ایک کمرہ میں بند کرا دیا۔ اور مزدوروں سے کام لیتا رہا۔ جب شام ہوئی تو سب اشرفیاں تھیلوں میں بھروا کر مزدوروں کے سر پر رکھ کر پنڈت جی کی خدمت میں لایا۔ گانگو برہمن حسن کی دیانت داری دیکھ کر حیران رہ گیا۔

گانگو شاہی منجم تھا۔ اُس نے حسن کا زائچہ کھینچا اور کہا کہ تو ایک زمانے میں بادشاہ ہوگا۔ مجھ سے یہ وعدہ کر کہ بادشاہ بن کر مجھے نہیں بھولیگا۔ اور میرے نام کو بھی اپنے لقب بادشاہی کا جزو بنائے گا۔ حسن نے وعدہ کر لیا۔ جب جلا نے

اسے بادشاہ بنایا تو علاءالدین حسن گانگو بہمنی کے لقب سے تخت سلطنت پر بیٹھا۔

گانگو برہمن اس کے دوسرے دن دربار شاہی میں گیا اور شہزادہ سے حسن کی ایمانداری کا ذکر کیا شہزادے نے حسن کو طلب کیا اور اپنے باپ شاہ تغلق کے پاس لے گیا۔ بادشاہ نے حسن کو اپنے پاس نوکر رکھ لیا اور وہ تھوڑے دنوں میں امیران صدہ میں شامل کر لیا گیا۔ اور ظفر خان علائی کے بھائی نے حسن کے ساتھ اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیا کی دعوت میں شہزادہ محمد تغلق آئے۔ جب دعوت ختم ہوئی اور شہزادہ باہر نکلا تو حسن گانگو حضرت کی خانقاہ کے دروازہ پر آیا۔ حضرت نے اس وقت فرمایا۔ سلطانے رفت۔ سلطانے آمد۔ پھر خدمت گار کو بھیجکر حسن کو اپنے پاس بلایا اور اس کے حال پر بہت التفات فرمایا روٹی کھلائی اور کہا۔ تجھے چتر شاہی ایک مدت دراز کی محنت کے بعد نصیب ہوگا۔

ایک مورخ حسن کا نسب نامہ شاہان ایران سے ملاتا ہے اور اس کا نسب نامہ اس طرح لکھتا ہے۔

سلطان علاءالدین حسن شاہ ابن کیکاؤس ابن محمد ابن علی۔ ابن حسن۔ ابن شام ابن ہمون۔ ابن سلام ابن ابراہیم۔ ابن نصر ابن مغلور۔ ابن رستم۔ ابن کیقباد۔ ابن منوچہر۔ ابن نامدار ابن اسفندیار۔ ابن کیومرث ابن خورشید ابن معسائی۔ ابن فغفور۔ ابن فرخ۔ ابن شہریور۔ ابن عامر۔ ابن مشہد۔ ابن ملک داؤد۔ ابن ہوشنگ ابن نیک کردار۔ ابن حیروانجت۔ ابن فرح۔ ابن صالح سے بہرام گور تک۔ بہرام گور سے ساسان بہمنی ابن اسفندیار بن کیانی تک۔

۷۴۵ھ مطابق ۱۳۴۵ء میں جب نصرت خان نے بیدر کا محاصل ہضم کر کے بغاوت کی تو شاہ نے قلیچ خان کو اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ نصرت خان گرفتار ہوا۔ اسی زمانے میں امیر ظفر خان علائی کے بھانجے نے اپنے سب بھائیوں کو جمع کر کے شورش مچائی اور گلبرگہ اور بیدر کے صوبہ داروں کو مار ڈالا۔ قلیچ خان نے اس کی بھی گوشمالی کی اور بادشاہ کے پاس بھجوا دیا۔ بادشاہ نے اس کے بھائیوں کو غزنی کی جانب جلاوطن کر دیا۔ اس کے بعد وہ لوگ پھر دہلی آئے۔

اور قتل کر دئے گئے۔ اس اثنا میں بادشاہ سے مفسدوں نے قلیچ خان حاکم دکن کی شکایت کی۔ بادشاہ نے اس کو دکن سے طلب کیا۔ اس کی جگہ نظام الدین عالم الملک کو مقرر کیا۔ اب بادشاہ نے عماد الملک کو دکن کا سپہ سالار مقرر کیا۔ سردار الملک اور یوسف کو جو بڑے امیر تھے اس کے ساتھ کیا۔ اور حکم دیا کہ عالم الملک سے مشورہ کر کے دکن کا بندوبست کرتے رہیں۔ اس کے بعد سلطان نے عزیز حمار نام ایک امیر کو مالوہ کی حکومت دی۔ اور روانہ ہوتے وقت کہا کہ جس قدر ملکوں میں شورش ہو رہی ہے وہ امیران صدہ کی وجہ سے ہے۔ ان کا کوئی تدارک کرو۔ اس نے مالوہ پہنچ کر ایک روز امیران صدہ کی دعوت کی۔ اور ستر امیروں کو فریب سے قتل کر ڈالا۔ جب یہ خبر اطراف و جوانب میں مشہور ہوئی تو امیران صدہ جن میں سے ہر ایک کے ماتحت سو سوار تھے بہت بگڑے اور انتقام کے لئے موقع کا انتظار کرنے لگے۔ ملک مقبل خان جہان وزیر گجرات، گجرات سے دہلی خزانہ اور گھوڑے بھیج رہا تھا امیران صدہ نے اس کو لوٹ لیا اور عزیز حمار کو قتل کر ڈالا۔ بادشاہ ان کی سرکوبی کو خود نکلا۔ سرحد گجرات میں لڑائی ہوئی۔ باغیوں نے شکست کھائی۔ ملک مقبول عماد الملک نے ان کا تعاقب کر کے انھیں تباہ و برباد کر دیا۔ جب یہ لوگ وہاں سے بھاگے تو مالوہ دکن وغیرہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ سلطان نے صرف گجرات کے امیران صدہ کو مارنے اور برباد کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ احمد لاچین۔ ملک علی سرجاندار اور عالم الملک کے پاس قاصد بھیجا اور حکم دیا کہ ڈیڑھ ہزار سواروں کی حفاظت میں امیران صدہ کو فوراً روانہ کرو۔ ظاہر میں تو یہ بتایا کہ ان کی ضرورت ہے لیکن باطن میں بادشاہ کا ارادہ امیران صدہ کو مار ڈالنے کا تھا۔ جب یہ دونوں امیر دولت آباد پہنچے تو عالم الملک نے رائچور۔ مدگل، گلبرگہ، بیجاپور کنجوٹی۔ رائباغ۔ کلہر۔ سیکری۔ برار۔ رنگیر وغیرہ کے امیران صدہ کو طلب کیا مگر وہ نہ آئے۔ آخر عالم الملک نے ملک احمد لاچین کو ڈیڑھ ہزار سوار دے کر روانہ کیا۔ ملک احمد لاچین نے نصیر الدین خلجی۔ قزلباش۔ حاجب۔ حسام اسمٰعیل افغان۔ حسن گانگو۔ نور الدین۔ وغیرہ امیران صدہ کو گلبرگہ میں جمع کیا۔ اور انھیں لے کر بادشاہ کے پاس چلا راستے میں احمد لاچین نے ان لوگوں کو ایسی وحشتناک باتیں سنائیں کہ یہ سب کے سب پریشان ہوئے آپس میں

مشورہ کرکے واپسی پرکمر باندھی۔ جب لاچین مانع ہوا توان لوگوں نے جن کے پاس چار ہزار مسلح آدمی موجود تھے۔ حملہ کرکے لاچین کو قتل کرڈالا۔ لاچین کا ساتھی ملک علی بھاگ گیا، وہاں سے وہ لوگ دکن آئے۔ یہاں بہت سے لوگ جو بادشاہ کے خلاف تھے ان کے ساتھ شریک ہوگئے۔ ان لوگوں نے دولت آباد کا محاصرہ کیا، اس کے بعد عالم الملک حاکم دکن کو گرفتار کرلیا۔ بہت سے شاہی امراء کو مار ڈالا۔ گجرات کے امیر جو بادشاہ کے ڈر سے چھپے ہوئے تھے وہ بھی ان سے آملے۔ محمد تغلق کے مقابلے میں تمام دکن باغی ہوگیا، برسوں کی محنت میں جو ملک فتح ہوا تھا وہ یوں دفعتہً ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے اسمٰعیل افغان کو جو امرائے دوہزاری میں سے تھا۔ اپنا بادشاہ بنالیا۔ اُسے ناصر الدین بادشاہ کا خطاب دیا۔ اور حسن گانگو کو ظفر خان کا خطاب ملا۔ اور گلبرگہ رائباغ، سکری، کلہر جاگیر میں ملے۔ بیرن رائے حاکم گلبرگہ کو جو محمد تغلق کا بڑا امیر تھا قتل کرڈالا گیا۔

غرض دکن محمد تغلق کی حکومت سے نکل گیا۔

یہ واقعہ ۷۴۸ھ ہجری کا ہے۔ جب یہ خبر بادشاہ کو ملی تو ملک گل افغان عماد الملک وغیرہ کو ہمراہ لیکر دولت آباد پر چڑھائی کی۔ اِدھر ناصر الدین شاہ نے بھی تیس ہزار سپاہیوں سے مقابلہ کیا۔ جب شام ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے بالمقابل خیمہ زن ہوئے۔ اس وقت باغیوں نے یہ مشورہ کیا کہ میدان میں بادشاہ سے مقابلہ کرنا مناسب نہیں۔ ناصر الدین شاہ دولت آباد میں رہ کر قلعہ کی حفاظت کرے اور حسن گانگو بارہ ہزار سوار لیکر گلبرگہ چلا جائے۔ باقی سردار بھی اپنی جاگیروں کی حفاظت کریں اور بروقت ایک دوسرے کی مدد کریں۔ جب بادشاہ چلا جائے سب لوگ دولت آباد آجائیں۔ چنانچہ یہ سب اس مشورہ پر عمل کرکے رات ہی کو روانہ ہوگئے صبح کو بادشاہ نے میدان باغیوں سے خالی دیکھا تو سخت تعجب کیا۔ وہاں سے نکل دولت آباد کا محاصرہ کیا۔ تین مہینے تک لڑائی ہوتی رہی لیکن کسی کو بھی فتح نصیب نہ ہوئی۔ اس اثناء میں بادشاہ کو خبر ملی کہ حاکم گجرات کے نائب نے ملک مظفر کو قتل کرکے بھڑوچ کا محاصرہ کرلیا ہے۔ بادشاہ نے یہ خبر سنتے ہی امیر قوام الدین کو مع دیگر

امراء کے دولت آباد کا محاصرہ سپرد کیا اور خود فوراً گجرات سے روانہ ہوا۔ راستہ میں ناصر الدین شاہ کے بعض امراء نے تعاقب کر کے بہت تنگ کیا۔ تربداندی کے کنارے تک بادشاہ کے اسباب کو لوٹتے رہے اور بہت کچھ مال لیکر دولت آباد آئے۔ ادھر حسن گانگو بادشاہ کے چلے جاتے ہی ہزار سواروں کے ساتھ عماد الملک کے سر پر جا پہنچا تلنگانہ کے رایہ نے بھی حسن کی پندرہ ہزار سپاہ سے امداد کی۔ اسمٰعیل، ناصر الدین شاہ نے بھی پانچ ہزار سپاہی بھیجے ملک سیف الدین غوری سپہ سالار مقرر ہوا۔ طرفین میں خوب جنگ ہوئی۔ عماد الملک مارا گیا۔ اس کے ہمراہی قندہار اور مانڈو کی جانب بھاگ گئے۔ حسن گانگو بہمنی ملک سیف الدین کو قندہار اور بیدر کا محاصرہ تفویض کر کے آپ اسمٰعیل ناصر الدین کی مدد کو دولت آباد آ گیا۔ قوام الدین جسے بادشاہ دولت آباد کا محاصرہ سپرد کر گیا تھا اس کے آتے ہی بھاگ نکلا۔ ناصر الدین شاہ حسن گانگو ظفر خان کا استقبال نظام پور تک کر کے دولت آباد لے آیا۔ اور چودہ روز تک جشن رہا۔

ناصر الدین شاہ کو معلوم ہو گیا تھا کہ تمام رعایا کے دلوں میں حسن گانگو کی محبت ہے اور سب اس کی عزت کرتے ہیں۔ اس لئے اس نے تمام امراء کو بلا کر یہ اعلان کیا کہ چونکہ میں اب بوڑھا ہو گیا ہوں سلطنت کا کام مجھ سے نہیں ہو سکتا اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کوئی دوسرا شخص یہ بار گراں اٹھائے۔ میرے نزدیک اس خدمت کے لئے حسن گانگو بہت موزوں ہے۔ سب لوگوں کو اس پر اتفاق ہوا۔ اور ۲۴ ربیع الثانی ۷۴۸ھ ہجری کو قطب الدین مبارک شاہ خلجی کی مسجد میں حسن گانگو کے سر پر تاج شاہی رکھا گیا اور اس کے نام کا دکن میں خطبہ پڑھا گیا۔ سلطان علاء الدین حسن گانگوئے بہمنی لقب ہوا۔ گلبرگہ کو مبارک سمجھ کر اس کا نام حسن آباد رکھا گیا اور وہی پایۂ تخت قرار پایا طغرا اور فرمان وغیرہ میں حسن اپنا نام یوں لکھا کرتا تھا۔ کمترین بندہ حضرت سبحانی علاء الدین حسن گانگوئے بہمنی۔ پنڈت گانگو اب شاہ تغلق کی نوکری چھوڑ کر حسن شاہ کے پاس چلا آیا تھا۔ حسن شاہ نے اسے حسب وعدہ تمام ممالک محروسہ کا محاسب مقرر کر دیا۔ بہت سی فتوحات کیں۔

گیارہ سال سلطنت کی۔ تین بیٹے چھوڑے تھے۔ داؤد، محمود۔ ۶۷ سال کی عمر میں ۷۵۹ھ ہجری میں

انتقال کیا۔ اس خاندان میں ۱۸ بادشاہ گزرے ہیں اور یہ خاندان ۷۴۸ھ ہجری سے ۹۳۴ھ ہجری تک ۱۸۷ سال دکن پر حکومت کرتا رہا۔ اس کے بعد دکن میں طوائف الملوکی ہو گئی بہمنی سلطنت کے صوبہ دار خود مختار بادشاہ ہو گئے اور اپنے اپنے نام کا سکہ اور خطبہ جاری کیا۔ یوسف عادل شاہ بیجا پور کا فرمانروا احمد شاہ نظام الملک بحری احمد نگر کا فتح اللہ عماد الملک برار کا بادشاہ بن بیٹھا۔ محمد قاسم برید بیدر کا سلطان ہوا اور سلطان قلی قطب الملک نے گولکنڈہ میں آزاد سلطنت قایم کی۔

صغرا ہمایوں مرزا

غزل

وان نزاکت تھی یاں تک نہ آسکے — یاں نقاہت تھی یہ کہ جا نہ سکے
جوشِ گریہ نے کر دیا خاموش — قصۂ غم اُنھیں سنا نہ سکے
مل گئی ہم کو راہ جنت کی — تیرے کوچہ میں راہ پا نہ سکے
یوں سما جاؤ میری نظروں میں — پھر کوئی دوسرا سما نہ سکے
کر دیا رعب حسن نے بیخود — حرف مطلب زباں پہ لا نہ سکے
نہ رہا پاس رازِ اُلفت کا — زخم دل کو کبھی دکھا نہ سکے
نالوں نے عرش کو ہلا تو دیا — تیرے دل کو مگر ہلا نہ سکے
کی دم نزع اس نے پرسشِ حال — لب کو جنبش ہوئی بتا نہ سکے

سارہ بیگم سابق معلمہ محبوبیہ گرلز اسکول

سلاطین بہمنیہ کے سکے

سلطنت بہمنیہ کا بانی حسن گانگو بہمنی تھا تاریخ دکن ہمیں بتاتی ہے کہ اس نے اپنے نام کا کوئی سکہ جاری نہیں کیا اگرچہ تحفۃ السلاطین کے مؤلف نے لکھا ہے کہ حسن گانگو بہمنی نے اپنے نام کا سکہ جاری کیا تھا لیکن مؤلف مذکور نے سکہ کی کوئی کیفیت نہیں لکھی علاوہ اس کے حسن گانگو کے نام کا کوئی سکہ بھی اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ مورخین کے اس تذبذب سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ حسن گانگو کے زمانے میں کوئی بہمنیہ سکہ جاری نہیں ہوا۔ غیروں کے سکے مستعمل تھے غرض ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دکن میں سکۂ اسلامیہ کی ایجاد حسن گانگو کے بیٹے محمد شاہ بہمنی کے عہد سے ہوئی اور یہ اسی حکمران کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سارے دکن میں اسلامی سکے جاری ہو گئے۔ طلائی نقرئی اور مسی سکوں کا رواج عام ہوا۔ ہون سکوں کی جگہ اشرفیوں نے لے لی بہمنیوں کے سکوں کے قبل راجگان ہنود کے سکے رائج تھے اور یہ راجگان دکن اسلامی سکوں کے رواج کو بہت ناپسند کرتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ دکن میں اسلامی سکے رائج نہ ہونے پائیں چنانچہ عام طور پر مشہور ہے کہ صرافوں کو پوشیدہ طور پر ترغیب دیکر اسلامی سکوں کو گلا اور پگھلا کر نیست و نابود کرا دیتے تھے۔ کچھ عرصہ تک تو یہ کارروائی کامیابی کے ساتھ جاری رہی لیکن آخر راز فاش ہو گیا اور صرافوں کو اس عمل سے باز آنے کی تاکید اور تنبیہ کی گئی لیکن راجاؤں کی پشتی کی وجہ سے ان تمام صرافوں نے شاہی حکم کی تعمیل نہیں کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کے حکم سے تمام صرافان دکن کو ۷۶۱ھ میں تہہ تیغ کر دیا گیا مقتولین کی تعداد کس قدر تھی یہ تاریخ ہمیں ٹھیک ٹھیک نہیں بتاتی اس خونریزی کے بعد تمام لوگ خوفزدہ ہو گئے اور دکن کے تمام چھوٹے بڑے راجہ حلقہ بگوش ہو گئے۔ ان صرافان دکن کے قتل کو بعض تنگ نظر مورخین نے ظلم قرار دیا ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ انتظام سلطنت کے لئے ایسے نازک موقعوں پر سیاست اسی کی مقتضی تھی چنانچہ جیسا کہ تاریخ کے صفحات شاہد ہیں اس قتل عام کے بعد بہمنیہ سکہ نے بہت رواج پایا

آخر آخر میں جب محمود شاہ ثانی کے عہد سلطنت میں بہمنیہ سلطنت زوال پذیر ہوئی تو راجاؤں نے اسلامی سکوں کو پگھلا کر نیست و نابود کر دیا اور ان کے سکے بننے لگے۔ اس طرح رفتہ رفتہ بہمنی سکے سرزمین دکن سے غائب ہو گئے۔ سلطنت بہمنیہ کے زمانے میں تین قسم کے ہون (پرتاب = مساوی نصف ہون۔ اور فنم = مساوی ششم حصہ ہون) رائج تھے۔ علاوہ اس کے تغلقی اور علائی سکے مستعمل تھے۔ ہون کی مختلف قسموں میں کنٹی رائے کرناٹکی کا ہون بہت زیادہ معتبر سمجھا جاتا تھا۔ چونکہ اس کا سونا خالص ہوتا تھا۔ بقیہ جس قدر بھی ہون تھے ان کا سونا غیر خالص اور دوم درجہ کا ہوتا تھا۔ رائے کرناٹکی ہون کی قیمت بہ نسبت درجہ دوم کے ہون کے زیادہ ہوتی تھی۔ چنانچہ بادشاہوں اور راجاؤں کو نوروز اور عید وغیرہ کے موقعوں پر عمائدین سلطنت اور امراء بھی ہون بطور نذرانہ گذرانتے تھے۔ ہون کی قسمیں یوں تو بہت سی تھیں لیکن اختصاراً یہاں میں صرف چند کے نام درج کروں گی:-

نندی ہون	بھونی ہون	گرڈک ہون	گولکنڈہ ہون	بیجاپوری ہون	ہون راجہ کرناٹک	بیدری ہون
۱۰½ ماشہ	۱۱½ ماشہ	۱۲ ماشہ	۱۲ ماشہ	۱۰ ماشہ	۱۰ ماشہ	۱۲ ماشہ

تاریخ فرشتہ محمد شاہی ہون کی صرف چار قسمیں بتاتی ہے:-

محمدی ہون	محمدی ہون	محمدی ہون	محمدی ہون
۳ ماشہ	۶ ماشہ	تولہ	۲ تولہ

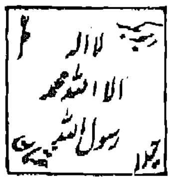
اسی طرح نقرئی سکے بھی کئی اقسام کے ہوتے تھے مثلاً:-

تنکہ محمدی	تنکہ محمدی	تنکہ علائی	تنکہ تغلقی
تولہ	نصف تولہ	تولہ	تولہ

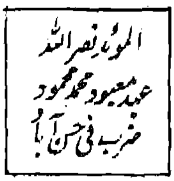
یہی حال مسی سکوں کا تھا ان کی بھی متعدد قسمیں تھیں:-

تنکہ علائی	جیتل	چلکا	تار
تولہ	مساوی ۲.۰ ر	مساوی نصف آنہ	مساوی ربع آنہ

بہمنیہ سلاطین کے سکوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ایک جانب وسط میں کلمہ شہادت اور اطراف خلفائے راشدین اربعہ رضی اللہ عنہم کے اسمائے مبارک کندہ کئے جاتے تھے اور دوسری جانب بادشاہ وقت کا نام اور دارالضرب و سنہ منقش ہوتا تھا۔ تمام سکے گول ہوتے تھے صرف محمد شاہ بن حسن گنگو بہمنی کا سکہ مربع شکل کا تھا اور اس پر عبارت اس طرح کندہ تھی۔ بعض ایسے سکے بھی دستیاب ہوئے ہیں جن میں دارالضرب اور سنہ کا پتہ نہیں چلتا اور نہ ان میں کلمہ اور خلفاء کے اسماء ہیں۔ اس اختلاف کی بظاہر تین صورتیں معلوم ہوتی ہیں۔



(پہلا رخ)



(دوسرا رخ)

اوّل تو یہ کہ محمد شاہ بہمنی بانی سکہ اسلامی کے دور حکومت تک سکوں میں کلمہ شہادت، خلفاء کے اسماء، دارالضرب اور سنہ کندہ ہوتے ہوں گے اور اس کے جانشینوں نے سکوں کا رنگ بدل دیا ہوگا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ طوائف الملوک وزراء جو بہمنیہ سلطنت پر آخر آخر میں حاوی ہو گئے تھے اور جو امامیہ مذہب کے پیرو تھے سکوں سے خلفاء کے ناموں کو خارج کر دیا ہوگا چنانچہ عادل شاہ۔ برہان نظام شاہ بحری اور قطب شاہ نے بجائے خلفاء کے ناموں کے بارہ ائمہ کے اسماء کندہ کرائے تھے۔

تیسرے یہ کہ سکے جعلی ہوں۔

"ف" بیگم۔ ادا

دکن کے چند تاجدار شعراء

بادشاہ کی ادنیٰ سی حرکت بھی ہمہ گیر اثر رکھتی ہے، عوام و خواص اس کی رفتار و گفتار، نقل و حرکت کی تقلید باعث فخر سمجھتے ہیں۔ جس چیز سے بادشاہ کو دلچسپی ہوتی ہے عوام الناس کا اس میں دلچسپی لینا لازمی ہے۔ اس کے ذوق و شوق کا رعایا آئینہ ہوتی ہے۔ زہے نصیب اس قوم کے جس کو عالم، فاضل، ہمدرد، سخی، علم پرور، حوصلہ افزا بادشاہ ملے۔

ہم یہاں دکن کے چند ایسے حکمرانوں کا ذکر کرتے ہیں جنہوں نے نہ صرف اپنی شاہانہ سرپرستیوں سے دکن میں علم کے دریا بہادئے بلکہ خود بھی علم و ہنر کے شائق، شعر و سخن کے دلدادہ تھے۔

شاہان عادل شاہی

جب دکن کی زبردست سلطنت بہمنیہ کو زوال ہوا تو مختلف صوبہ داروں نے اعلان خودمختاری کرکے اپنی اپنی علیحدہ سلطنتیں قائم کرلیں۔ ان میں ایک سلطنت بیجاپور بھی ہے۔ یہ سلطنت حقیقی معنوں میں سلطنت بہمنیہ کی جانشین کہی جاسکتی ہے۔ اس نے بہمنی ادب کو زندہ کیا۔ بہمنی دربار کے بھٹکے علما و شعرا کا واحد ٹھکانہ بیجاپور تھا۔ عادل شاہی حکمران یوں تو سب کے سب علمی و ادبی ذوق رکھتے تھے اور علما و ادبا کی سرپرستی ان کا اہم فریضہ تھا لیکن ہم یہاں صرف شاعر تاجداروں کا مختصر حال اور نمونہ کلام پیش کرتے ہیں۔

یوسف عادل شاہ ۸۹۵ھ تا ۹۱۶ھ یوسف عادل شاہ بانی سلطنت عادل شاہیہ، بیجاپور، کا بچپن نہایت تنگی اور عسرت میں گذرا۔ سلطنت بہمنیہ میں یہ ایک غلام کی حیثیت سے آئے اور اپنی بہادری اور قابلیت کی وجہ سے بادشاہ کی نظروں میں وقعت پائی۔ مصاحبت سے ترقی کرتے ہوئے صوبہ داری کا عہدہ پایا۔ جب بہمنی سلطنت میں جھگڑے ہونے لگے تو اس وقت یہ بیجاپور کے صوبہ دار تھے۔ انھوں نے نزاکت حال کو محسوس کرکے غیر ملکی

سپاہیوں اور افسروں کو ہموار کیا، اور سلطنت عادل شاہی کی بنیاد ۸۱۵ھ میں ڈالی۔ اس خاندان نے تقریباً دوسو سال تک شان وشوکت سے فرمانروائی کی۔

یوسف عادل شاہ فارسی کے بلند پایہ شاعر تھے، فن موسیقی سے بے حد دلبستگی تھی اور اس میں خاصہ کمال حاصل تھا۔ شاعروں اور مغنیوں کی ہمت افزائی اور قدر دانی ان کا مشغلہ تھا۔ خود بھی موسیقی کے جلسوں میں فی البدیہہ اشعار کہتے تھے۔ دور دور سے علما و فضلا، کو دعوت دی جاتی تھی اور ان کو بیش بہا تحائف عطا ہوتے تھے۔ کم وبیش بیس برس حکومت کر کے ۹۱۶ ہجری میں وفات پائی۔

اسمٰعیل عادل شاہ ۹۱۶ھ تا ۹۴۱ھ

اسمٰعیل عادل شاہ، اپنے باپ یوسف عادل شاہ کے، بہت چھوٹی سی عمر میں جانشین ہوئے۔ اس لئے ابتدائے حکومت میں امرا سلطنت کا انتظام کرتے تھے۔ اسمٰعیل عادل کی تربیت ان کی چچی نے کی جو ایک قابل اور دور اندیش ایرانی خاتون تھیں۔

اسمٰعیل عادل اپنے باپ کی طرح صاحب علم تھے۔ علما، و فضلا، کی محبت کا چسکہ تھا۔ خود بھی اپنے عہد کے اعلیٰ پایہ شاعر تھے۔ وفائی تخلص تھا۔ مصوری و موسیقی سے بھی لگاؤ تھا۔ سخی اور دور اندیش تھے۔ علما، وشعرا پر بے دریغ روپیہ صرف کرتے تھے۔ ۹۴۱ھ میں سلطان نے وفات پائی۔ مؤرخین بیجاپور نے ان کی داد و دہش، قدر دانی اہل کمال کی بڑی تعریف کی ہے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی ۹۸۸ھ تا ۱۰۳۷ھ

ابراہیم عادل شاہ ثانی اپنے چچا علی عادل شاہ کے بعد سریر آرائے مسند بیجاپور ہوئے۔ یہ اپنے چچا کی طرح نہایت لائق اور قابل تھے۔ شعر و سخن کا ذوق بدرجۂ اتم تھا۔ ابراہیم تخلص کرتے تھے۔ علاوہ شعر و شاعری کے فن موسیقی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔ خوشنویسی کا ذوق بھی تھا اور اعلیٰ پایہ کے خوشنویس تھے۔ زبان اُردو سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کا دربار شعرا و علماء سے بھرا ہوا تھا۔ عہد کے نامور اور قابل اہل سخن جمع تھے۔ کہا جاتا ہے ہندوستان میں شہنشاہ اکبر کے پُرشوکت دربار کے بعد انھیں کا دربار شاندار تھا۔

ابراہیم عادل نے گجرات کے درماندہ شعرا کو اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور ان کی بڑی قدر دانی فرمائی

زبان اُردو سے جو شغف سلطان کو تھا اس نے دفاتر میں فارسی کی بجائے اردو کو جانشین کرایا۔ علم موسیقی سے جو لگاؤ تھا وہ "نورس" سے ظاہر ہے۔ یہ کتاب سرود ہندی کے ضوابط و قوانین پر لکھ کر سلطان نے اپنے ذوق اور مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ اس کا دیباچہ، ان کے درباری شاعر ملا ظہوری نے فارسی میں لکھا ہے، جو سہ نثر ظہوری، کے نام سے موسوم ہے۔ بادشاہ کو لفظ 'نورس' بہت پسند تھا۔ ان کے استعمال کی ہر شئے 'نورس' کے نام سے موسوم تھی۔

ابراہیم ایک عالم، ادیب، شاعر اور ماہر موسیقی کی حیثیت سے کمال شہرت کے مالک تھے۔ قصائد و غزلیات میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ان کا آخری دور بیجاپور کے لئے سنہری دور کہا جائے تو بے جا نہیں کیونکہ ان کا عہد نہ صرف علم و فضل ہی کی وجہ سے ممتاز تھا بلکہ اس کو امن و اطمینان اور انتظام سلطنت کے اعتبار سے بھی خاصہ امتیاز حاصل تھا۔ انھوں نے علم کی ترویج میں جو جو کوششیں کی ہیں وہ صفحات تاریخ پر زرّیں حروف میں لکھی جائیں گی۔

۱۰۳۷ھ میں سلطان نے وفات پائی۔ باوجودیکہ انھیں اُردو سے خاص اُنس تھا مگر ان کا اُردو کلام نایاب ہے چند ہندی اشعار پیش ہیں۔

نورس سور جگ جگ جوتی ان سو دُکنی — یوست سرستی ماتا ابراہیم پرسا رستی دونی

شمالی عنبر بتیاں پھرائے — شربت گھول امرت پلائے

بادل و ماسے بجلیاں بجاوے — باجی خالو آشتابی تے پاوے

سہلا نورس کلیاں بدھاوے — ابراہیم گرگنی گاوے

علی عادل شاہ ثانی ۱۰۶۷ھ تا ۱۰۸۳ھ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے پوتے علی عادل شاہ ثانی نے خالص ادبی ماحول اور خدیجہ سلطانہ جیسی علم دوست خاتون کے آغوش میں پرورش پائی، اس لئے بچپن ہی سے ان کو شعر و سخن کا ذوق تھا۔ ایک اچھے شاعر تھے۔ شاہی تخلص کرتے تھے۔ ان کی مشق سخن اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ اکثر اپنے مصاحبین کے نظموں کی اصلاح کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے استاد عالم کہلائے۔

ولیعہدی کے زمانے ہی سے یہ علماء و اہل کمال کے قدرداں تھے۔ جب حکومت کی عنان سنبھالی تو ان کی علمی قدردانیوں میں اضافہ ہوا جس نے علمائے وقت کو ہر طرف سے سمیٹ کر بیجاپور میں جمع کرلیا۔ ان کا دربار باکمالوں کا سرچشمہ تھا۔ سلطان کے جود و سخا، ان کی علمی لیاقت اور قابلیت و قدردانی علم و ہنر کے اکثر مورّخ معترف ہیں۔

شاہی نے جملہ اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصائد سے شاہانہ شوکت ظاہر ہوتی ہے۔ مثنویاں واقعہ نگاری کا اچھا نمونہ ہیں۔ کلام میں صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔ سلطان کا شوق شاعری ایسا تھا کہ ان کے عہد میں بیجاپور شعر و سخن کا مرکز ہوگیا تھا۔ گھر گھر شعر و شاعری کے چرچے تھے۔ ہر طرف مشاعرے اور شعر و سخن کی محفلیں گرم تھیں۔ سنہ ۱۰۸۳ھ میں اس علم دوست سلطان کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد ہی بہت جلد سلطنت بیجاپور مغلوں کا شکار ہوگئی۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

غزل:-

مرجان میں صفائی نہیں یاقوت میں صافی اچھے — جس ذات میں صافی اچھے اس ذات کوں گوہر کہو
یاقوت ہور مرجان کی شاہی لکھیا ساری غزل — سنکر جگت کے شاعراں اس شعر کوں افسر کہو

رُباعی

سب ویس گیا ہے دھن تے لڑتے لڑتے — کھٹ رات گئی ہے پاتوں پڑتے پڑتے
کیا نبکہ مدن کا ادبنج لگتا ہے مجھے — ہے پانوں ہے پرت کے چڑتے چڑتے

عادل شاہی سلاطین کی شاہانہ فیاضیوں اور ذاتی دلچسپیوں نے ذوق سخن کو اس قدر عام کردیا تھا کہ سلطنت کے زوال پر ملک کا گوشہ گوشہ شعراء و ادباء سے پر نظر آتا تھا۔ اس عہد کا ادبی سرمایہ اگرچہ گولکنڈہ کی بہ نسبت بہت کم محفوظ رہا لیکن جو کچھ بھی ہے امتیازی شان رکھتا ہے۔

سلطنت بیجاپور کے زوال کے بعد یہاں کے علماء و فضلاء نے گولکنڈہ کی راہ لی اور اس طرح بیجاپور کی ادبی اہمیت ہمیشہ کے لئے ختم ہوگئی۔

سلاطین قطب شاہی

بہمنی سلطنت کے زوال پر جو پانچ سلطنتیں قائم ہوئیں ان میں سے ایک گولکنڈہ کی قطب شاہی سلطنت ہے۔ قیامِ سلطنت بیجاپور کے اٹھارہ سال بعد اس سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔ شاہانِ قطب شاہی بھی، عادل شاہی سلطانوں کی طرح علم پرور اور علم دوست تھے۔ اس عہد کے تاجدار شاعر یہ ہیں۔

جمشید قلی قطب شاہ ۹۵۰ھ تا ۹۵۷ھ۔ جمشید قلی نے اپنے باپ سلطان قلی قطب شاہ، بانیٔ سلطنت گولکنڈہ کو قتل اور اپنے بھائی ملک قطب الدین کو جو اصلی وارثِ تخت و تاج تھے اندھا کر کے خود سلطنت سنبھالی۔ یہ بدنام بہت تھے اس لئے مورخین نے ان کے ادبی کارناموں کو نظر انداز کر دیا۔

جمشید قلی کو شعر و سخن سے خاص دلچسپی تھی اور خود شاعر تھے گولکنڈہ کی قدیم مخطوطات میں ان کا فارسی کلام ملتا ہے۔ سات سال کی حکمرانی کے بعد ۹۵۷ھ میں ان کی وفات واقع ہوئی۔

محمد قلی قطب شاہ: ۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ سلطان ابراہیم قلی قطب شاہ کے فرزند، محمد قطب شاہ ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے یہ گولکنڈہ کے سب سے مہتم بالشان بادشاہ تھے۔ ان کا دورِ حکومت ترقیٔ علم و فن کے لحاظ سے خاص طور پر مشہور ہے۔ سلطان کو فنونِ لطیفہ کا بے حد شوق تھا۔ ان کا ذوقِ شاعری اور ان کے عہد کی عمارتیں اس کی شاہد ہیں۔

محمد قلی قطب شاہ ایک اچھے شاعر اور ادیب تھے۔ اردو میں معانی اور فارسی میں قطب شاہ تخلص تھا۔ وہ نہایت فیاض و رحم دل علماء و شعراء کے بڑے سرپرست تھے۔ ان کی جود و سخا کا شہرہ سن کر عرب و عجم سے علماء و ادباء ان کے دربار میں آتے اور ان کی فیاضی سے بہرہ ور ہوتے تھے۔

سلطان کا کلیات ۱۰۲۵ھ ہجری میں مرتب ہوا۔ تقریباً ہر صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا اسلوبِ بیان نہایت سادہ ہے۔ خیالات کو نہایت روانی اور خوبی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ غزل میں عاشقانہ اور صوفیانہ رنگ جھلکتا ہے۔ قدرت نگاری اور واقعات نویسی میں استادانِ فن پر سبقت حاصل ہے۔ ان کا موضوع بالکل ہندوستانی ہے

کلام میں فارسی کے ساتھ ساتھ ہندی کی کافی آمیزش ہے اور فارسی کے برخلاف ہندی اسلوب کو اختیار کیا ہے یہ زبان اردو کے زبردست محسن خیال کئے جاتے ہیں سنہ ۱۰۲۰ھ میں ان کا انتقال ہوا ۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

قصیدہ

محمد ناؤں تھے بتا محمد کا لے بن سارا　　سو طوباں سوں سہانا ہے جنت نمنے چمن سارا

دیے فانوس کے درمیانے تھے جوں جوت دیوے کا　　سو تیوں دستا دوالاں میں تھے میویاں کا بن سارا

غزل

مج عشق کے گداکوں اور رنگ شاہی دیا　　سب عاشقاں منج لگتے ہیں طفل جوں دنبالا

روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ　　بھر لے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

سلطان محمد قطب شاہ : سنہ ۱۰۲۰ھ تا ۱۰۳۵ھ ۔ سلطان محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ کے بھتیجے اور داماد تھے سنہ ۱۰۲۰ھ میں سریر آرائے سلطنت ہوئے ۔ اپنے چچا کی طرح یہ بھی شاعر تھے اور صاحب دیوان بھی ۔ شعر و شاعری میں مہارت تھی اور ٹھوس علمی قابلیت کے مالک تھے ظل اللہ تخلص تھا ۔ عالموں، فاضلوں کی قدردانی گویا آبائی پیشہ تھا ۔ ان کا دربار اہلِ سخن سے بھرا رہتا تھا اور علمی مجالس کا بازار گرم ہوتا تھا۔

ظل اللہ کو مختلف اصناف سخن میں کمال حاصل تھا ۔ ان کا کلام بھی اسلوب کی خوبی اور سادگی میں اپنے چچا سے کم نہیں ہے ۔ پندرہ سال حکمران رہ کر سنہ ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی ۔ نمونہ کلام یہ ہے :-

چلے چندنی میں لٹک پیو ہمارا　　ادن مکھ دیپے چندر تھے اپارا

لبے جس میا میں پرت ہم سجن سے　　بن اس کی پرت کچھ نہیں اس پیارا

جتنے سائیں کے عشق کا مد پیا ہے　　نکر سے او سے ہور مستی اوتارا

عبداللہ قطب شاہ : سنہ ۱۰۳۵ھ تا ۱۰۸۳ھ محمد قطب شاہ کے فرزند عبداللہ قطب شاہ اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوئے ۔ پچاس سال حکومت کی ان کا دور، قطب شاہی دورِ حکومت میں سب سے بڑا ہے ۔ ان کے عہد میں اورنگ زیبی یورش شروع ہو چکی تھی تاہم علمی سرگرمیوں میں فرق نہ آیا ۔ علماء و فضلاء کی قدردانی آبا و اجداد سے ورثہ میں

علمی تھی۔ یہ خود بھی عالم اور شاعر تھے۔ عبداللہ تخلص کرتے تھے۔ رات رات بھر مجلس مشاعرہ گرم رہتی عالی قدر شعراء اپنا کلام سناتے مباحثے کرتے تھے۔

سلطان ذی علم تھے اور اہلِ علم کی ہمت افزائی اور قدر دانی کرتے تھے۔ صاحبِ دیوان تھے۔ ان کے کلام میں لفظی شان و شوکت اور زبان کی سلاست خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ان کے عہد میں مرثیہ کو خصوصیت حاصل ہے اردو زبان کی ترقی کے لئے بھی یہ دور مشہور ہے۔

مورخ نظام الدین احمد نے سلطان کی سوانح عمری حدیقۃ السلاطین کے نام سے لکھی ہے جس سے اس زمانے کی طرزِ معاشرت پر روشنی پڑتی ہے۔ سنہ ۱۰۸۳ھ میں انتقال ہوا۔ نمونہ کلام پیش ہے:۔

تجھ بہشتی حور کو دیکھا ہے جن   جم حرام اس پر ہے دوزخ کا عذاب
شاہ عبداللہ نبی صدقے تجھے   خوب رویاں میں کیا ہے انتخاب

ابوالحسن تاناشاہ: سنہ ۱۰۸۳ھ تا سنہ ۱۰۹۸ھ۔ ابوالحسن تاناشاہ، عبداللہ قطب شاہ کے داماد اور گولکنڈہ کے آخری تاجدار تھے۔ ان کا عہدِ حکومت پندرہ سالہ ہے۔ پورا زمانہ اورنگ زیب سے لڑائیوں میں بسر ہوا۔ اس لئے علمی انہماک کا موقع نہ ملا۔ شاعر تھے لیکن آپ کا کلام مفقود ہے۔ کہیں کہیں چیدہ چیدہ اشعار پائے جاتے ہیں۔

ابوالحسن سخن فہم اور سخن سنج بادشاہ تھے۔ اردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے خیالات پر تصوف کا رنگ غالب تھا، نیک دل صوفی منش بادشاہ کی حیثیت سے اب بھی یاد کئے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۰۹۸ھ میں شہنشاہ اورنگ زیب نے گولکنڈہ پر فتح پائی۔ قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ سلطان ابوالحسن کو قید کر کے اورنگ آباد بھیج دیا گیا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ سلطان کا ایک شعر مشہور ہے۔

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل پہ پھل بھرا ٹ ہے
اک بات کے ہوں گے سجن یاں جی ہی بارہ باٹ ہے

سلطنتِ گولکنڈہ میں برخلاف سلطنتِ بیجاپور کے ادبی فضا قائم رہی۔ سلطنت کے زوال نے اس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ گولکنڈہ کے علما قطب شاہی سلاطین کی سرپرستی سے محروم ہو کر اور کہیں کا آسرا نہ رکھتے تھے اور وہیں رہنے پر مجبور تھے۔ اس لئے دکن کی ادبی فضا مکدر نہ ہونے پائی۔ دہلی ان کے لئے بہت دور تھی اور خود اس میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ علما نے دکن کے قیام ہی کو غنیمت سمجھا اور وہ علمی سرگرمیاں بدستور جاری رہیں جو شاہانِ قطب شاہی کے عہد میں جاری تھیں۔ اس کے بعد بہت جلد ہی حیدرآباد مغلوں کی فتوحات کا دارالحکومت بن گیا جس سے اہلِ علم کی ایک حد تک ڈھارس بندھی۔

شاہانِ آصفیہ

سنہ ۱۱۳۶ھ میں نظام الملک بہادر کی اعلان خودمختاری نے دکن کو پھر ایک سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ شاہانِ آصفیہ نے علم و ادب کی دل کھول کر ہمت افزائی کی اور کر رہے ہیں۔ اس دور کے شاعر حکمران یہ ہیں۔

نواب نظام الملک آصفجاہ اوّل سنہ ۱۱۳۶ھ تا سنہ ۱۱۶۱ھ بانیٔ خاندان آصفیہ، نواب قمرالدین خان، حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی اولاد سے ہیں۔ آپ کے والد خواجہ شہاب الدین کو دربارِ شاہی میں اعلیٰ مراتب حاصل تھے۔ عالمگیر کے دربار سے غازی الدّین خان، فیروز جنگ کا خطاب پایا۔ شاہجہاں کے قابل وزیر سعد اللہ خان کی صاحبزادی سے آپ کی شادی ہوئی۔ اس طرح نواب قمرالدّین خان، غازی الدّین خان کے فرزند اور سعد اللہ خان کے نواسہ ہیں جو نظام الملک آصف جاہ اول کے مبارک لقب سے آج یاد کئے جاتے ہیں۔

سنہ ۱۰۸۲ھ میں آپ کی ولادت ہوئی۔ عہد عالمگیری میں ترقی کرتے ہوئے قلیچ خان کا خطاب اور منصب چارہزاری پایا۔ شاہ عالم بہادر شاہ نے خان دوران خان کا خطاب اور صوبہ داری اودھ عطا فرمائی۔ اور اسی طرح سلطنت کے مختلف اہم خدمات سے سرفراز ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ محمد شاہ کے عہد میں سنہ ۱۱۳۴ھ میں وزارت کا اہم عہدہ آپ کے تفویض ہوا۔ اسی زمانہ میں نادری حملے جاری ہوئے۔ سلطنت دہلی بہت کمزور ہو گئی۔ آپ نے

اس کے سنبھالنے کی کوشش کی لیکن حاسدانِ زمانہ نے بادشاہ کو آپ سے بدظن کرادیا جس کے باعث آپ نے دکن کی طرف رجوع کیا جہاں پہلے آپ صوبہ دار رہ چکے تھے۔

صوبہ دارِ وقت نے آپ کا مقابلہ کیا، شکست کھائی۔ آپ منصور و فتح یاب داخلِ دکن ہوئے اور سلطنتِ آصفیہ کی ۱۱۳۶ھ میں بنا ڈالی۔

آصف جاہ اول ذی علم اور علم و ہنر کے قدرداں تھے۔ آپ کی علمی قدردانی ضرب المثل تھی۔ بگڑی دلی کے اہلِ کمال کا ملجا و ماویٰ دربارِ آصفیہ تھا۔ بہت سارے علمائے دہلی آپ کے ہمراہ دکن چلے آئے تھے۔ اورنگ آباد آپ کا پائے تخت تھا۔

نواب قمرالدین خان آصف جاہ اول فارسی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ اُردو میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ عبدالقادر بیدل سے فارسی میں اصلاحِ سخن کی ہے آصف اور شاکر تخلص کرتے تھے پچیس سال حکمراں رہ کر ۱۱۶۱ھ میں آپ نے وفات پائی۔ آپ کا ایک شعر یہ ہے۔

کالی نہ کہو کوئی میرے دلبر کوں حسد سے ۔۔۔ مجھ دل کی کلی بیچ دعا کی لمبی ہے

ناصر جنگ بہادر: ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۴ھ۔ آصف جاہ اوّل کے خلف الرشید، نواب نظام الدولہ، ناصر جنگ میر احمد خان بہادر، اپنے باپ کے انتقال پر مسند نشین ہوئے۔ نواب ناصر جنگ بہادر کے بھانجے مظفر جنگ نے دعوئ حکومت کیا۔ آپس میں جھگڑے پیدا ہوئے جس کی وجہ سے سلطنت آصفیہ کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔

۱۱۶۴ھ میں فرانسیسیوں سے لڑ رہے تھے کہ ہمت خان نامی پٹھان نے بندوق چلا کر شہید کیا۔ ناصر جنگ فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ کئی دیوان موجود ہیں۔ اُردو میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ناصر تخلص کرتے تھے۔ علمی قدردانی اور علم پروری کا خاص ذوق تھا۔ علماء و مشائخین کے علاوہ طلباء کے لئے وظائف مقرر تھے تاکہ شائقینِ علم قوت بسری کی فکر سے فارغ رہ کر اپنے علمی مشاغل میں منہمک رہیں۔

نمونہ کلام یہ ہے :-

نین تیرے شکار کرتے ہیں — دل ہمارا فگار کرتے ہیں
خوب رُو جب سنگار کرتے ہیں — آرسی پر بہار کرتے ہیں
کسی بیدا دسوں چمن میں آج — پھول سارے پکار کرتے ہیں
اہلِ دل گریۂ ندامت سیں — سیر ابر بہار کرتے ہیں
چشم بد دور دلبراں سارے — اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں

محبوبِ دکن، نواب میر محبوب علی خان بہادر :- ۱۲۸۵ھ تا ۱۳۲۹ھ محبوب دکن کی ولادت ۱۲۸۵ھ میں ہوئی - تین برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہو گئے ۱۲۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے اور حکومت کی سنبھال کے لئے ایجنسی کا قیام عمل میں آیا -

آپ کی تعلیم و تربیت نہایت فکر و توجہ کے ساتھ ہوئی - انگریزی، اردو، فارسی اور عربی میں عمدہ لیاقت بہم پہنچائی گئی - اٹھارہ سال کی عمر میں باضابطہ مسند نشیں ہوئے اور حکومت کی باگ سنبھالی -

آپ خلقی ذہین تھے - شعر و سخن کا ذوق فطری اور موروثی تھا - اُردو میں طبع آزمائی فرمائی ہے - آصفؔ تخلص تھا - حضرت داغؔ کو آپ کی استادی کا شرف حاصل تھا -

آپ کی شاہانہ سرپرستیوں اور فیاضیوں نے حیدرآباد کو اہلِ علم و کمال کا مرکز بنا دیا اس کی خاموش فضا میں ایک تحریک پیدا کر دی - شہر کے گوشے گوشے میں علمی انجمنیں قائم ہوئیں اور مشاعرے کی محفلیں برپا ہونے لگیں امراء و غرباء، خاص و عام میں شعر و سخن کا ذوق پیدا ہوا - عہدِ حاضر کے اکثر نازک خیال شعراء اسی ذوق کی پیداوار ہیں آپ کی غرباپروری اور سخاوت ضرب المثل ہے -

حضرت آصفؔ کو جملہ اصنافِ سخن پر قدرت حاصل تھی - علاوہ غزلیات کے اصلاحی اور اخلاقی نظمیں بھی لکھی ہیں

رعایا کے سپاس ناموں کے جواب میں عمدہ اور بے مثل نظمیں اکثر و بیشتر لکھی ہیں، اخلاقی نظموں کی طرح آپ کی عاشقانہ اور دلکش غزلیات بھی قابلِ تعریف ہیں۔ آپ کی غزل میں داغ کی سلاست اور سادگی کے ساتھ معنی آفرینی اور شاہانہ رعب و داب پایا جاتا ہے۔ لطفِ زبان، ترکیب کی خوبی، فصاحتِ مضمون محاورات روزمرہ بھی ہر طرح لائقِ داد ہیں۔ ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء میں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ بڑے ہر دلعزیز فرمانروا تھے۔ اب تک اہلِ حیدرآباد آپ کی یاد میں سر دھنتے ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:۔

یہ دل آشنا اور نا آشنا ہے — بھلوں سے بھلا اور بروں سے برا ہے
نہیں ہے اگر تو ہمارا، تو کیا ہے — زمانہ میں کوئی کسی کا ہوا ہے
پیو بھی پلاؤ بھی اس کا مزہ ہے — یہ شیشہ دھرا ہے یہ ساغر دھرا ہے
کریں تنکدے سے عبث قصدِ کعبہ — یہاں بھی خدا ہے وہاں بھی خدا ہے
کہاں جائے انسان ان سے نکل کر — زمیں فتنہ گر ہے، فلک فتنہ زا ہے
یہ کافر، لعیں اک جگہ جمع ہوں گے — جہنم میں بھی اک طرح کا مزا ہے
ہمارے بھی ہے امتحاں میں یہ آصف — لگانا ہی دل کا سراسر خطا ہے

سلطان العلوم نواب میر عثمان علی خان بہادر :- ۱۳۲۹ھ۔ آپ کی ولادت ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں ہوئی۔ ۱۹۱۱ء میں آپ سریر آرائے حکومت ہوئے آپ کے عہد کی ترقیات اظہر من الشمس ہیں ہر اعتبار سے اس دور کو دکن کا عہدِ زرّیں کہا جا سکتا ہے۔ اس وقت حیدرآباد، رشکِ بغداد و قرطبہ ہو رہا ہے ہر طرف علمی سرگرمیاں بڑی شدّ و مد سے جاری ہیں۔ حیدرآباد علم و فن کا سرچشمہ ہو گیا ہے۔

آپ کو ذوقِ شاعری ورانتاً ملا ہے۔ اس پر آپ کی غیر معمولی ذہانت نے وہ کام کیا جو آگ بارود کے ساتھ کرتی ہے۔ آپ کی اعلیٰ دماغی مثالاً پیش کی جاتی ہے آپ کی غزل اور سلام سخت سے سخت نقادانِ

اُردو کے پاس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ غزل میں قدیم اُستادانِ فن کی پختہ مشقی اور قدرتِ زبان کے ساتھ ساتھ جدید رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ آپ کا کلام حضرت آصف کی طرح شاہانہ رفعت سے مملو ہے۔ عثمان تخلص ہے۔ حضرت فصاحت جنگ جلیلؔ کو آپ کی اُستادی کا فخر حاصل ہے۔

سلطان العلوم کا کلام دنیائے ادب میں خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اُردو زبان کی ترقی آصفیہ حکومت کا شعار رہا ہے۔ لیکن سلطان العلوم نے جامعۂ عثمانیہ قائم فرما کر اس زبان پر بڑا زبردست احسان کیا ہے ارادی اور غیر ارادی طور پر سیکڑوں شاعر و ادیب اس سے پیدا ہو رہے ہیں۔

حضرت عثمانؔ کی علمی سرپرستیاں اور فیاضیاں ضرب المثل ہو چکی ہیں ان کا اس مختصر جگہ ذکر کرنا محال ہے۔ ایک دنیا اس ابرِ کرم سے بہرہ ور ہے۔ خدائے پاک آپ کو حوادثاتِ زمانہ سے محفوظ اور دکن پر تا دیر قائم رکھے۔ اور اہلِ دکن کو آپ کے زیرِ سایہ ہر طرح پھلنا پھولنا نصیب کرے۔ آمین۔

نمونہ کلام پیش ہے:۔

دیکھ کر چہرہ ترا ماہِ درخشاں کی قسم
پھنس گئے دام میں ہم زلفِ پریشاں کی قسم

اور بھی لگے گہر و لعل پہ مرنے والے
ہم مٹے لب پہ ترے لعلِ بدخشاں کی قسم

مثلِ پروانہ بنے دیکھ کے صورت تیری
جل کے ہم خاک ہوئے شمعِ شبستاں کی قسم

موسمِ گل کا نیا تو بھی دکھا دے نقشہ
پی لے اے شیخ تجھے سبزۂ وریحاں کی قسم

پس کے سو بار رہِ عشق بتاں میں اکسیر
بن گئی خاک ہماری درِ جاناں کی قسم

دیکھ لے قیس لسے جامہ دری کہتے ہیں
تار باقی نہ رہا جیب و گریباں کی قسم

ہو گئی ختم نبوت جو نبی پر عثمانؔ
ہے یہ ایمان ازل سے مرا قرآں کی قسم

اردو شہ پارے ۔ دکن میں اردو ۔ مخطوطات دکھنی ۔ جدید اُردو شاعری ۔ تاریخ ریاست حیدر آباد ۔ سے مدد لی گئی ۔ ممتاز جہاں صوفی

احساسِ فرض

شہزادہ معظم سے تاناشاہ کی دو دو باتیں

بتاؤں کیا تجھے اے نورِ عینِ عالمگیر
کہ تاج و تخت بھی کھو کر نہیں ہوں میں دلگیر

جو پوچھتے ہو تو کہتے ہوئے بھی عار نہیں
بتاؤں ؟ کس لئے دل میرا بے قرار نہیں

نہیں ہے جو کرب نمایاں بہ لوحِ پیشانی
سبب یہ ہے کہ ہے دل خوگرِ پریشانی

تاثرات کی جاذب ہے فطرتِ بشری
محیطِ قلب پہ قادر ہے وسعتِ نظری

تغیرات سے مجھ کو کوئی ملال نہیں
کمال ہے کوئی ایسا جسے زوال نہیں؟

نہیں ہے رنج مجھے سلطنت کے جانے کا
نہیں ہے خوف مجھے سختیاں اٹھانے کا

مصیبتیں جو پڑیں گی خوشی سے جھیلوں گا
یہی ہے حکمِ قضا تو میں جان پہ کھیلوں گا

طلائی نقروی محلوں کی چاندنی راتیں
مجال کیا ہے زباں پر جو آئیں وہ باتیں

نظر نہ آئیں گے آرائشوں کے خواب کبھی
خیالِ خام ہے ہوگا نہ اضطراب کبھی

جہاں میں دیکھی تھی شاہی و برتری میں نے
یہ آج دیکھ لی مالک کی داوری میں نے!

گواہ ہیں اسی شاہی محل کے بام و در
ہوں آج جانے پہ مجبور، کل تھا آنے پر

سرِ نیاز ہے خم، جو وہ بے نیاز کرے
ذلیل و خوار کرے، یا کہ سرفراز کرے

ق
مگر شاہی تھی اک فرض کی پکار مجھے
سدا رکھے گا یہ احساس، بے قرار مجھے

″ دیا فریب نہ دل کو کبھی امارت کا
نہ سمجھا اپنے تئیں مستحق ریاست کا

″ نہ سر میں آنے دیا زعم بادشاہت کا
کہ میں امین تھا قطب شاہ کی امانت کا

″ بھلا جو دیتا یہ احساسِ فرض، میرا ضمیر
تو زحمتیں نہ اٹھاتی یہ فوجِ عالمگیر

″ تھا میرا فرض ریاست کروں سپرد اس کے
بدن میں خون قطب شاہی ہو رواں جس کے

وَلے مآل اگر حسبِ مدعا نہ ہوا
خدا کا چاہا ہی آخر ہوا ــــ بُرا نہ ہوا

بشیر النساء بیگم بشیر

دکن کے ایک ولی

دکن کا خطہ اپنی قسمت پر نازاں ہے کہ اس سرزمین پر بے شمار اولیاء و مشائخین نے قدم رکھے ہیں۔ ان کے قدوم میمنت لزوم سے برکات و فیوض کے سرچشمے اب تک جاری ہیں۔ ان کے نام لیوا و معتقدین ہر ایک بڑے شہر قصبہ و موضع میں موجود ہیں اور ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ اہل دکن ہمیشہ سے خوش اعتقاد رہے اور حصولِ ہدایات و ارشادات کی طرف ان کا خاص رجحان رہا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ صوفیائے کرام بزرگان دین و اولیاء و عارفین نے اس خطہ کو سرفراز کیا۔ بعض تو دور دراز ممالک سے سیاحت کرتے ہوئے آئے اور یہاں متوطن ہوگئے اور اکثر اس مبارک سرزمین پر تولد ہوئے۔ ان کے مزارات دکن کے چپہ چپہ میں واقع ہیں۔ مریدین و معتقدین ہر سال عظمت و احترام سے عرس کرتے ہیں۔ صندل چڑھاتے ہیں۔ ہر مذہب و ملت کے افراد شریک جلوس رہتے ہیں۔ ان کے ارواحِ مقدسات سے مرادیں چاہتے ہیں اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوتے ہیں ایک ایسے ولی باتدبیر کے بصیرت افروز حالات زندگی پیش کئے جاتے ہیں جن کی اعلیٰ معیار قابلیت و حسن سلوک نے خاص و عام سے خراجِ تحسین حاصل کرکے اُن کو مقبول و عزیز بنا دیا تھا۔ اَللّٰهُ نَوَّرَ قُلُوْبَ الْعُرَفَاءِ بِمَعَارِفِهٖ وَشَرَحَ صُدُوْرَ الْاَوْلِيَاءِ بِحَقَائِقِهٖ۔

حسین شاہ ولی قدس سرہ بن شاہ نصیر اللہ عرف صفی اللہ ثمانی بن اسد اللہ کا شجرۂ نسب حضرت مخدوم حسینی بندہ نواز گیسودراز تک پہونچتا ہے۔ آپ کی کنیت ابو عبد اللہ۔ نصیر الدین لقب حسین نام اور حسین شاہ ولی عرف ہے۔ آپ بیدر شریف میں پیدا ہوئے۔

ابھی حضرت کا عالمِ شباب ہی تھا کہ آپ عبادت و یادِ الٰہی میں مشغول رہتے اعتکاف میں بیٹھتے اور

اکثر عوام الناس سے علیحدہ شور و شغب سے دور اسرارِ الٰہی و کشف کے جویا رہتے۔ دفعتاً آپ کو خیال ہوا کہ گلبرگہ سے لوگوں کی آنکھ بچا کر کسی ایسے مقام پر نکل جائیں جہاں آپ کی کسی سے جان پہچان نہ ہو تاکہ گوشہ نشینی میں خوش آیند و پُر سکون زندگی اطمینان سے گذرے۔ اس ارادہ سے آپ نے کوچ کیا اور گولکنڈہ تشریف لائے۔

اس وقت یہاں ابراہیم قطب شاہ حکمران تھا۔ بادشاہ کا مذہب امامیہ تھا لیکن سنی رعایا اور امرا کی دلداری و دلجوئی کو پیش نظر رکھتا۔ سنی و شیعہ کو برابر سمجھتا ہنگامہ و فساد سے ڈرتا تھا کیونکہ رعایا میں اکثر افغان و حبشی تھے اس کو فتنہ و فساد و سلطنت کے درہم برہم ہونے کا ہر وقت خوف لگا رہتا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ علمائے دین و اولیاء اللہ و مشایخ و سادات کے ساتھ حسنِ اعتقاد رکھتا ان کی خدمت کو اپنا فرض سمجھتا ان کی حد درجہ تعظیم و تکریم روا رکھتا ان کے لئے وظیفے مقرر کرتا اور ہر طرح سے اُن کی دلجوئی کرتا تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ کو اطلاع ہوئی کہ حسین شاہ ولی تشریف لائے ہیں تو آپ کی خاطر و مدارات کے لئے مع تحایف معتمدین بھیجے۔ وزراء و امراء کو روانہ کیا تاکہ آپ کو نہایت تزک و احتشام کے ساتھ دربارِ شاہی میں لائیں۔ بادشاہ حضرت سے ملکر بہت خوش ہوا اور اس درجہ گرویدہ ہوا کہ پہلی ہی ملاقات میں آپ کو دس ہزار فوج کی سپہ سالاری دی اور معتمدی تعمیرات پر آپ کا تقرر کیا۔ آپ نے اس عہدہ جلیلہ کے قبول کرنے سے انکار کیا اور بہت گھبرائے لیکن تمام علماء نے سمجھایا کہ آپ کا اِتقا و ثروت کو ناپسند فرمانا درست ہے لیکن یقین جانئے کہ سلاطین کا تقرب آپ کے لئے خواہشات نفسانی و عیش و عشرت کی زندگی کا ہرگز کفیل نہ ہوگا آپ صرف عوام الناس کا خیال کیجئے اور محض اُن کی خاطر اس عہدہ کو قبول فرمالیجئے تاکہ آپ ان کا وسیلہ بن جائیں اور بادشاہ کی قربت مخلوق کے لئے منفعت بخش ثابت ہو۔ بادلِ ناخواستہ مجبور ہو کر آپ نے گو ظاہری امارت قبول فرمالی مگر باطن میں آپ فقیر ہی رہے آپ صاحب کرامت و عارفِ معرفت تھے آپ ہر شخص کو خواہ امیر ہو یا فقیر اپنے توسل سے فائدہ پہنچاتے ان کی معیت میں اپنا عزیز وقت صرف کرتے ان کے رنج و مسرت میں حصہ لیتے آپ کے ہاں ایک دربار سا لگا رہتا تھا۔ ہر کس و ناکس خاص و عام اپنی حاجتیں بیان کرتے اور

انجام مرام کو پہونچا۔ آپ کا دربار شاہانہ دربار سے کم نہیں تھا لیکن کسی قسم کی ممانعت نہیں تھی کوئی مزاحمت نہ ہوتی۔ ہر شخص باریاب ہوسکتا تھا۔ آپ خادمِ خلق تھے۔ ہمدردی و جذبۂ ایثار کی شان ملاحظہ ہو آپ کو فنا فی اللہ کا مرتبہ حاصل ہوچکا تھا لیکن خدمتِ عباد کے لئے زندگی وقف کردی تھی اور صرف فلاح و رفاہ عام کی غرض تھی کہ تقرب سلطانی پسند فرمایا ورنہ ذاتی مفاد کی کوئی خواہش نہیں تھی۔

ابراہیم قطب شاہ نے حضرت سے اپنی ایک دختر نیک اختر کا عقد کرکے دامادی کی عزت سے ممتاز فرمایا اور جاگیر و منصب سے سرفراز کیا۔ شہزادی کے بطن سے حسین شاہ ولی کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ جدامجد ہونہار نواسے کی ذکاوت و فراست پر نازاں تھے۔ امام الملک خطاب عطا کیا لیکن افسوس کہ عین عالم شباب میں فوت ہوگیا۔ والد ماجد کو صدمۂ روح فرسا ہوا۔

ابراہیم قطب شاہ نے اپنی دختر شہزادی خیرۃ النساء بیگم کے نام پر خیرت آباد کا بازار آباد کروایا۔ ایک مسجد تعمیر کی گئی شاہی عمارتیں بنوائی گئیں اور شہزادی ممدوحہ اسی مقام پر فروکش ہوگئیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے جگہ نہایت پُرفضا تھی۔ بادشاہ بھی کبھی کبھی تفریح کے لئے اور شہزادی کو دیکھنے آیا کرتا تھا۔ خیرت آباد کے قریب ایک چھوٹا سا کنٹہ تھا۔ خیرۃ النساء بیگم نے ایک روز اپنے والد کی خدمت میں معروضہ پیش کیا کہ اس محلہ کی آبادی روزافزوں ترقی کررہی ہے اگر حضور توجہ مبذول فرمائیں تو کنٹہ کو بڑھا کر ایک تالاب بنا دیا جائے تاکہ اہل محلہ کو صاف و شیریں پانی پینے کے لئے میسر ہو اور زراعت و باغات کی آبیاری بھی ہوسکے۔ پھر شہزادی نے دست بستہ التماس کی کہ اس ناچیز کی آرزو ہے کہ اس تالاب کا نام بعد تعمیر حضور کے نام پر رکھا جائے۔ بادشاہ نے اس تجویز کو قبول فرمایا اور ارشاد ہوا کہ حسین شاہ معتمد تعمیرات سے مشورہ کیا جائے۔ حضرت کو بادشاہ کی رائے سے اتفاق ہوا اور فرمان شاہی ملا کہ تالاب حضرت کی نگرانی میں تعمیر کیا جائے۔ حسین شاہ نے اس کام کو اپنے ذمہ لیا اور دو سال کی جانفشاں محنت کے بعد خلائق کو فائدۂ عام پہونچانے کیلئے تالاب بنوا دیا۔ چونکہ تعمیری تمام کام آپ کے

زیر اہتمام ہوتے تھے اور آپ کی عزت وشہرت عام ہوچکی تھی۔ معمار و مزدور و عوام نے اس تالاب کو حسین ساگر کے نام سے مشہور کر دیا۔ مگر تیار شدہ تالاب کا نام شہزادی خیرۃ النساء بیگم نے ابراہیم ساگر تجویز کیا اور بہت کوشش کی گئی کہ اس نام کو زبان زد خاص و عام کیا جائے۔ خود حضرت نے بہ نفس نفیس و دیگر امراء و وزراء نے اس میں حصہ لیا لیکن تمام سعی لاحاصل ثابت ہوئی اور تالاب اب تک حسین ساگر کے نام سے ہی موسوم ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کو رقابت کا ذرا بھی رنج نہیں ہوا بلکہ ارادت صادقہ و عقیدت راسخہ سے بادشاہ نے فرمایا "خیر یہ تالاب آپ ہی کے نام پر رہے ہم دوسرا تالاب اپنے نام پر تعمیر کروالیں گے"۔

ایک عرصہ بعد خیرۃ النساء بیگم کا انتقال ہوگیا۔ بادشاہ کے ساتھ تمام اہل دربار کو ملال ہوا۔ خیریت آباد کی مسجد کے قریب مرحومہ کی نعش امانتاً مدفون رہی اور قبر پر حسین شاہ ولی نے ایک پختہ گنبد تعمیر کروا دی۔ چند روز بعد صندوق لاشہ نکالا گیا اور تیمناً کربلائے معلی روانہ کر دیا گیا لیکن اب تک خالی گنبد مرحومہ کی یادگار موجود ہے۔

حسین شاہ ولی کی طبیعت میں چستی و چالاکی تھی۔ فن سپاہگری تیر اندازی و نشانہ لگانے میں استاد کامل تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک روز شہزادہ محمد قلی قطب شاہ کی سواری میں ہمرکاب تھے۔ اتفاق سے چیل نے شہزادہ کے لباس کو نجس کر دیا حضرت پر ناگوار گذرا۔ فوراً بندوق کا نشانہ لگایا چیل پھڑپھڑاتی ہوئی زمین پر آن پڑی۔ بعض مورخین نے اس حکایت کو یوں بیان کیا بلکہ چیل کی طرف نگاہ غضب سے دیکھا اور چیل وہیں کباب سوختہ بنکر گر پڑی۔ شہزادہ و دیگر امراء آپ کے خرق عادت و کرامت کے معترف ہوئے اور باپ سے زیادہ شہزادہ کے دل میں آپ کی جگہ ہوگئی اور اعزاز و اکرام بھی زیادہ کرنے لگا۔ ایک مدت تک شاہی خدمات وفاداری سے انجام دیتے رہے۔ آخر میں دنیوی مشاغل سے مستعفی ہوگئے اور گوشہ نشین ہوکر یاد الہی میں

سنہ ۱۰۶۸ھ

منہمک ہوگئے۔ حضرت حسین شاہ ولی انار اللہ برہانہ نے سو سے زیادہ عمر پائی۔ آپ کا وصال ۱۴ جمادی الثانی میں واقع ہوا۔ مادۂ تاریخ وفات :۔ "ع رفت از دنیا حسین پاک دین" ہوا۔ مزار شریف گولکنڈہ کے قریب پہاڑی کے نیچے ہے۔ مرقد مبارک پر ہر جمعہ اور جمعرات کو اجتماع عظیم رہتا ہے۔ لوگ پھول چڑھاتے ہیں۔ فاتحہ پڑھتے ہیں۔

مسز صوفی

مکہ مسجد کا سنگ بنیاد

جس شہزادہ کے معاشقے نے سلطان ابراہیم کو پرانے پل کی تعمیر پر مجبور کر دیا۔ خود اس کا دورِ حکومت کس قدر رنگین نہ ہوگا۔ سلطان قلی قطب شاہ ایک فیاض اور عاشق مزاج بادشاہ گذرا ہے۔ اس کے زمانہ میں بھاگ نگر (حیدر آباد قدیم) پریم نگر بنا ہوا تھا۔ خود سلطان اپنی پوری زندگی میں عشق و محبت کے ذخار سمندر کی لہروں سے کھیلتا رہا۔ بھاگ نگر (حیدر آباد) کی آبادی اسی کی رنگینیٔ طبیعت کی مرہونِ منت ہے۔

محمد قلی قطب شاہ کے انتقال کے بعد اس کا بھتیجا محمد قطب شاہ ۱۰۲۰ھ ۱۶۰۲ء میں تخت نشین ہوا۔ جو کہ محمد قلی قطب شاہ کا داماد تھا۔ اس بادشاہ نے پندرہ برس حکومت کی۔ یہ ایک عادل سخی۔ دیندار اور منصف مزاج بادشاہ گذرا ہے۔ ایک اچھا، مدبر اور سیاست داں ہونے کے ساتھ ساتھ وہ علم دوست اور انتہا درجہ کا خدا پرست بھی تھا۔ اکثر شعراء و علماء کو اس نے مالا مال کر دیا۔ احادیث اور کلام مجید پر اس کو کافی عبور حاصل تھا۔ اس نے سلطنت کا رنگ ہی بدل دیا۔ بجائے جہاں ناچ رنگ کی محفلیں جما کرتیں وہاں نماز اور تلاوت قرآن اور جہاں عشق و محبت کی داستانیں ہوا کرتیں وہاں دینی و مذہبی مباحثے ہونے لگے۔ رعایا بھی چند ہی دنوں میں بادشاہ کے رنگ میں رنگ گئی۔ اور سمجھ گئی کہ پہلے عشق مجازی سکھایا جاتا تھا اور اب عشق حقیقی کی تلقین ہو رہی ہے۔ اور وہ مرکز دکھایا جا رہا ہے جہاں ہر ایک کی نجات ہے۔

ویسے تو بادشاہ کی ذاتی صفات نے رعایا میں پابندی صوم و صلوٰۃ کی روح پھونک دی تھی مگر شاہ کو اس سے تسکین نہ ہوئی۔ چونکہ اس وقت شہر میں کوئی شاندار مسجد نہیں تھی اور بادشاہ کو فن تعمیر سے بھی خاص دلچسپی تھی اس لئے اس نے ایک مسجد بنوانی چاہی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ شاہ وسط شہر میں

ایک نہایت ہی عالیشان مسجد تعمیر کروانی چاہتے ہیں جس کی وسعت اتنی ہوگی کہ اس میں تمام مسلمان رعایا اپنے بادشاہ کے ساتھ نماز ادا کر سکے گی"۔ اس کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ وقت مقررہ پر تمام رعایا وسط شہر میں جمع ہو جائے تاکہ اس مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا جائے۔

فرمان کے سنتے ہی بھاگ نگر کے علاوہ اس کے اطراف و اکناف کی رعایا اس مقدس کام کو دیکھنے کے لئے جوق در جوق آنے لگی۔ اور وقت مقررہ سے قبل دار السلطنت پہنچ گئی اور مقام معینہ پر ایک کثیر مجمع جمع ہو گیا۔ تھوڑی دیر میں سادہ مزاج بادشاہ کی سواری جو ہر طرح کے تزک و احتشام سے مبرا تھی آ پہنچی۔ رعایا نے نہایت خلوص کے ساتھ خیر مقدم کیا اور سب کی نگاہیں نقیب کی طرف پلٹیں۔

شاہی نقیب نے مجمع کے بیچوں بیچ آکر یہ اعلان کیا کہ "اعلیٰ حضرت جلالت مآب عالم پناہ سلطان محمد قطب شاہ کا حکم ہے کہ اس مسجد کا سنگ بنیاد وہی شخص رکھے جس نے ۱۲ سال کی عمر سے اب تک نماز پنجگانہ اور تہجد قضا نہ کی ہو"۔ یہ اعلان ایسا حیران کن تھا کہ پورا مجمع پریشان ہو گیا۔ ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈالے اپنی شرمندگی کو نباہ رہا تھا۔ دوسری دفعہ پھر وہی اعلان ہوا۔ مجمع پر سکوت طاری ہو گیا۔ سب حیران تھے کہ ایسا کونسا فرشتہ صفت انسان دنیا میں موجود ہے۔ تیسری دفعہ جب پھر وہی اعلان ہوا تو دو آدمی آگے آئے۔ اور آداب شاہی کے مطابق کورنش بجا لائی۔ ایک شخص نے خدائے واحد کی قسم کھا کر کہا کہ ایک روز فجر کی نماز پڑھ رہا تھا کہ سورج نکل آیا۔ دوسرے نے کہا کہ ایک دن تہجد کو فجر کے ساتھ ملا دینا پڑا۔ چند لمحے سکوت رہا۔ آخر کار خود قطب شاہ نے آگے بڑھ کر پروردگار عالم کی قسم کھائی اور کہا کہ "۱۲ سال کی عمر سے اب تک کوئی نماز میں نے قضا نہیں کی اور پابندی سے روزآنہ کلام مجید کی تلاوت کرتا ہوں اس لئے میں اس مسجد کا بنیادی پتھر رکھتا ہوں اور خدائے پاک سے دعا کرتا ہوں کہ یہ مسجد میری زندگی میں تیار ہو جائے اور میری نظریں ایک دفعہ بھاگ نگر کے تمام مسلمانوں کو اس مسجد میں ایک ساتھ نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں"۔ سنگ بنیاد بادشاہ نے خود رکھا۔ اور سواری شاہانہ

اسی شان کے ساتھ واپس چلی گئی۔ تمام رعایا پر بادشاہ کے اس زہد و تقوی کا ایسا اثر ہوا کہ چند ہی دنوں میں پوری رعایا نے عشقِ حقیقی کے نغمے الاپنے شروع کر دیے۔ اور اس صراطِ واحد کی طرف متوجہ ہو گئی جو سب کی نجات کا راستہ ہے۔

۳۰ لاکھ ہون اس عمارت پر صرف کئے گئے۔ محمد قطب شاہ کے زمانہ میں مکہ مسجد کا نام بیت العتیق رکھا گیا تھا جس کے معنی خانۂ بزرگ کے ہیں۔ بیت العتیق میں سنہ ۱۰۲۳ھ تاریخ بھی نکلتی ہے۔ افسوس ہے کہ باوجود قطب شاہ کی عین خواہش کے یہ مسجد اس کے زمانہ میں مکمل نہ ہو سکی۔ کچھ حصہ اس کے بعد کے دو بادشاہوں کے عہد میں اور باقی غیر مکمل حصہ اورنگ زیب کے زمانہ میں تیار ہوا۔ مکہ مسجد کے نام سے اسی عہد میں موسوم ہوئی۔ اورنگ زیب نے حصار، حوض۔ دروازہ۔ برج۔ کلس وغیرہ تعمیر کروائے۔ اور خانہ وسطی متصل ممبر کے (جو وسیع تھا) دیوار کھنچوا دی۔ مکہ مسجد کا طول (۷۰) درعہ عرض (۴۲) درعہ بلندی معہ کلس (۴۹) درعہ ہے۔

قطب شاہیوں کے بعد آصف جاہی بادشاہوں نے بھی اس کا پورا لحاظ اور احترام کیا چنانچہ اب تک وہ ہمیشہ آباد و پُر رونق نظر آتی ہے۔

قمر النساء بیگم

نذرِ دکن

آسودہ اسی طرح رعایا ہے دکن میں
جس طرح چہکتے ہوں طیور اپنے چمن میں

ہر سمت ہیں تنظیم خوش آئند کے چرچے
دن دونی ترقی ہے ہر اک شعبۂ فن میں

اے اہلِ دکن لاکھ بدل جائیں فضائیں
ہشیار! نہ فرق آئے روایاتِ کہن میں

لائی ہیں خواتینِ دکن بہرِ دکن آج
اک غنچۂ نورس کھلا "سب رس" کے چمن میں

کوزے میں سمندر کا سمانا تو سنا تھا
"سب رس" کی مہک دیکھیے اب "نذرِ دکن" میں

تنویر النساء بیگم تنویر

وطنیت

جذبات کی دنیا میں وطنیت ایک ایسا جذبہ ہے جس کے لئے صرف عمل ہی نہیں بلکہ ایثار لازمی ہے ۔ اس جذبہ کی پرورش پلنگ پر پڑے پڑے یا کرسی پر بیٹھے بیٹھے وقت گذارنے سے نہیں ہوتی ۔ خدا پرستی کی تکمیل ممکن ہے کہ مسجد یا مندر میں بیٹھ کر نماز ، دعاؤں ، پوجا پاٹوں سے ہو سکے لیکن وطن پرستی کا جذبہ ہر لحظہ عمل اور ہر گام پر قربانی چاہتا ہے وطن پرستی اس کا نام نہیں کہ " پیارا وطن ہمارا " بلند اور سُریلے راگوں میں گا کر خود کو خوش اور سننے والوں کو مسرور کر دیا جائے یا ان میں وقتیہ انتشاری کیفیت پیدا کر دی جائے ۔ میرا مطلب ان نغموں کی مخالفت نہیں مجھے معلوم ہے کہ انگریز HOME SWEET HOME کو اپنے وطن کا گیت سمجھتے ہیں اس کو گاتے وقت اتنے مبہوت ہو جاتے ہیں کہ ایک ریگستان کی مقام ایک ریتیلا میدان ایک بھیانک اونچا ٹیلا ایک طوفان بھرا سمندر انگلستان نظر آنے لگتا ہے ۔ انگلستان سے دور جب اس گیت کے راگ ان کے کانوں میں پڑتے ہیں تو ان کو غم آگین مسرت ۔ ایک ایسی خوشی جو ان کو اپنا ملک یاد دلا کر رُلاتی ہے پیدا کرتی ہے ۔ پیرس میں بیٹھ کر یہ گیت لندن کی ایک محفل میں گانے کے لئے لکھا گیا ۔ اس کا لکھنے والا امریکہ کا ایک باشندہ تھا اور اس کے سروں میں سسلی کا نغمہ پھر بھی یہ اس قدر مقبول ہوا کہ انگلستان کے گلی کوچوں میں عام ہو گیا اور اتنا اثر پذیر ہوا کہ سند دوام حاصل کر لی لیکن کوئی شخص اس بات کو ماننے پر تیار نہ ہوگا کہ اس گیت نے یا اس کیف نے جو یہ گیت پیدا کرتا ہے انگلستان کو بام ترقی پر پہونچایا ۔ اگر اس جذبہ کے ساتھ کاوش رہنمائیں آپس کا اتحاد اور ایثار نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا ۔

وطن کیا ہے زمین کا ایک حصہ جہاں ہم ہمارے باپ ، ماں ، چچا ، دادا ، یا ہمارے اجداد پیدا ہوئے ہوں بچے سے بوڑھے ہو کر جس خاک سے اٹھے ہوں اسی خاک میں مل جاتے ہوں ۔ یہ لفظ اپنی انتہائی وسعت میں ایک ملک کی سرزمین پر حاوی ہو جاتا ہے رفتہ رفتہ اس کے مناظر پھول خار زمین آسمان ہم میں اس قدر داخل ہو جاتے ہیں کہ ہم اور ہمارا دل

اس سے بیحد مانوس ہوجاتا ہے ہم اس کو بہتر سے بہتر مقام پر ترجیح دینا تو کجا پسند بھی نہیں کرتے ۔ بہتر و برتر مقام یا ممالک میں اپنے ملک کی بدتر سے بدتر ۔ چیز کیوں نہ ہو دیکھتے ہیں تو ہمارے دل میں خاصی کیفیت پیدا ہوتی ہے ہماری آنکھوں میں خاصی چمک پیدا ہوجاتی ہے اور محبت کا ایک جذبہ ہمارے چہرے سے نمایاں ہوجاتا ہے اور ہم کو وطن کی یاد بے تاب کردیتی ہے ۔ کیا یہی وطن پرستی ہے ؟

بخارا کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ ملک گیری کا جذبہ لئے فوج کشی پر آمادہ کررہا تھا ۔ وہ فوج کا دستہ سنبھال بخارا سے چل دیا ۔ اقبال نے یاوری کی جہاں گیا فتح کے ڈنکے بجے مال غنیمت ہاتھ آیا ایک سرسبز و شاداب مقام پر ڈیرے جمائے ہر دن عید اور ہر رات شب برات ۔ عیش و عشرت میں دن گذارنے لگا ۔ اب کہاں بخارا اور کہاں کا ہندوستان ۔ ساتھ والے پریشان ترکیبیں کیں لاکھ جتن کئے مگر بادشاہ سلامت واپسی کا نام نہیں لیتے آخر کو ایک ترکیب کارگر ہوئی ۔ دربار کے شاعر نے ایک پر اثر نظم لکھی بخارا کا سین کھینچا ایک شعر یاد ہے ۔

شاہ سرو است و بخارا بوستاں سرو سوئے بوستاں آید ہمی

یہ نظم دربار میں پڑھی بادشاہ صاحب کو وطن کی یاد نے گدگدایا اور واپسی کا حکم دیا ۔ کیا اس کو وطن کی محبت کہا جاسکتا ہے ۔ جس کو کہ پیغمبر نے ایمان کا جز قرار دیا تھا ۔ اگر اس کو حب وطن کہا جائے تو وہ شیر جو اپنے شکار کا خون پی کر شکار کو اسی مقام پر چھوڑ اپنی گوی کو واپس اپنے مقررہ مقام پر سوجاتا ہے اور یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ صبح تک اس کا شکار کوئی ہتیالے کہیں زیادہ محب وطن خیال کیا جائے گا ۔

ڈاکٹر جانسن نے اپنے احباب کے ساتھ وطن پرستی پر مباحثہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ

"patriotism is the last refuge of a scoundrel" ہم اس کے اس مقولہ کو غلط بھی نہیں کہہ سکتے ہیں تاریخ میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی ۔ خود غرض جاہ طلب گندم نما جو فروشوں نے وطن پرستی کے پاک جذبہ کی آڑ میں اپنی اغراض کی قربان گاہ پر سیکڑوں معصوموں کی بھینٹ چڑھائی ہے کیونکہ انھیں اچھی طرح معلوم تھا کہ

وطن کی محبت انسانی دل میں ایک فطرتی جذبہ ہے۔ دنیا کے ابتدائی زمانہ میں خون خوار جانوروں سے بچنے کے لئے انسان نے ایک جتھا بنایا پھر مختلف ہم خیال ہم زبان خاندانوں نے ملکر قبیلوں کی صورت اختیار کی قبیلے ملکر قوم بنی اور قومیت کے ساتھ وطن پرستی کا جذبہ پیدا ہوا۔ جو اپنے ابتدائی درجہ میں اپنی مقبوضات کی حفاظت کے خیال سے زیادہ نہ تھا یہی جذبہ اعلیٰ کرداری کے باعث کبھی بلند ہوتے ہوتے پاک و مقدس ایثار بن گیا اور خود غرضیوں کی وجہ سے بے آبروئی اور بے غیرتی ٹھیرا۔ وطن پرستی کبھی فوجی رنگ کا جامہ پہن جنگجوئی کی حامی قرار پائی اور دوسروں کی دولت و ثروت، اعلیٰ ذہنیت اور منتظمانہ زندگی کو برباد کرنے کے لئے ابھاری جانے لگی۔ ایتھنس کے ایک فلسفی نے حقیقی وطن پرستی پیدا کرنے کے لئے کیا خوب کہا ہے:۔

"میں ہر روز اس بات کی کوشش کروں گا کہ تمھاری نظریں ایتھنس کی ترقی پر لگی رہیں تاکہ تمھارے دل اس کی محبت سے معمور ہو جائیں جب اس کی عظمت تمھارے دلوں پر نقش ہو جائے تو تم اس پر غور کرو کہ یہ سلطنت ان لوگوں نے قایم کی جن میں اپنے فرض منصبی کو ادا کرنے کا احساس تھا اور جن میں اس خدمت کے بجالانے کی ہمت تھی جو لڑائی میں ہمیشہ بے آبروئی کے خیال سے ڈرتے رہے جنھوں نے ہار میں اپنی خوبیوں کو ہاتھ سے جانے نہ دیا اور پاکیزگی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے ملک کی قربان گاہ پہ ہنسی خوشی نثار کر دیا۔

الفریڈ، فرانسس ڈریک اور کرومول وغیرہ کے کارناموں میں یہ چیز آپ کو نظر آتی ہے لیکن میرے خیال میں ایک غریب لوہار نے وطن پرستی کی جو مثال قایم کی وہ ہزار مصلحین وطن کے کارناموں سے کہیں زیادہ ہے۔ اب سے سیکڑوں برس پہلے ایک دن فرانسیسی بیڑا ڈوور کے قریب دکھائی دیا۔ بہادر بوڑھے ہیوبرٹ ڈی برگ نے چیخ کر کہا کہ اگر یہ لوگ کنارے پر اتر گئے تو پھر انگلستان تباہ ہو جائے گا۔ کون اپنے ملک پر جان دینے کو تیار ہے ایک شخص نے کہا میں۔ پھر کیا تھا ایک جماعت بہت جلد جمع ہو گئی بوڑھے بہادر نے کہا کہ اگر میں شہر کی کنجیاں ان کے حوالے کر دوں تو مجھے دھارے پر چڑھا دینا۔ چند سال بعد ہیوبرٹ سے بادشاہ اور کلیسا دونوں خفا ہو گئے اور اس گاؤں کے لوہار کو حکم دیا

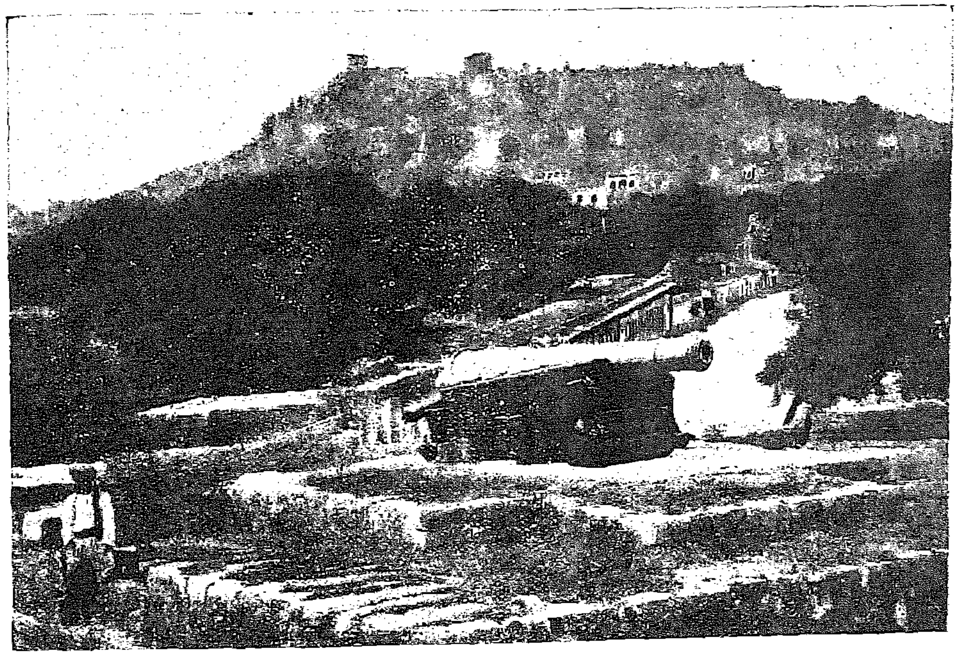
اس کو بیڑیاں پہنادو۔ اس بہادر وطن پرست نے کہا مجھے نہایت تکلیف سے مار ڈالو مگر مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ جس نے ڈوور کو فرانس سے بچایا اس کو بیڑی پہناؤں۔

دکن کی تاریخ میں بھی وطن پہ جان قربان کر دینے کی مثالیں موجود ہیں۔ صدیاں گزر گئیں سلطنتیں قائم ہوئیں اور مٹ گئیں لیکن چاند بی بی دکن کے آسمان پر ابھی تک چاند کی طرح چمک رہی ہے۔ احمد نگر کی خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر شہزادہ مراد ایک فوج کثیر لیکر دکن کا رُخ کرتا ہے۔ احمد نگر والے اوسان باختہ بیجاپور کی طرف بھاگتے ہیں چاند بی بی کی غیرت جوش میں آتی ہے اپنے بھتیجے کو بچانے، بلکہ یہ سمجھ کر کہ احمد نگر گیا تو بیجاپور اور گولکنڈہ کی بھی خیر نہیں بھاگوں بھاگ احمد نگر پہونچتی ہے یہ سمجھ کر کہ قلعہ کا محاصرہ کرلیں گے سامانِ ضروری مہیا کر کے دشمن کا انتظار کرتی ہے فوجی طاقت کے زور میں اکبر کا سورما فرزند احمد نگر میں داخل ہوتا ہے اور قلعہ کا محاصرہ کرلیتا ہے۔ چاند بی بی کے باعزت صلح کے پیغاموں کو نہ سنکر قلعہ پر حملہ کر دیتا ہے۔ یہاں تک کے قلعہ کی دیوار گرجاتی ہے قلعہ والوں کے دل ٹوٹ جاتے ہیں مگر یہ بہادر عورت گھوڑے پر سوار دل شکستوں سے کہتی ہے

"سنو تو اے بچو! اے بھائیو! سنو تو تم کدھر بھاگو گے اس میدان کی طرف اپنے دشمنوں کی تلوار سے ہلاک ہونے کے لئے؟ عزت کا واسطہ میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ دکن میں تا قیامت تمہاری بہادری کے گیت گائے جائیں گے۔ ہم عورتوں کی طرف دیکھو ہم دشمن کے ریلے سے نہیں ڈرتے، آؤ میرے دوستو! ٹوٹی ہوئی فصیل تک بڑھو۔ دیکھو میرے ساتھ آنا بہادری ہے، مرد ہو بزدل نہ بنو۔" استدعا کارگر ہوئی لاشوں پر لاشیں گریں فصیل درست ہوگئی اور قلعہ بچ گیا۔

چاند بی بی نے دیا مال و متاع سب ہی لُٹا	جان پر کھیل کے دشمن سے لیا ملک بچا
ایک دن وہ تھا کہ ہر زن تھی یہاں کی رُستم	لاج رکھتی تھی وطن کی نہ تھی پروائے ستم
عیش و عشرت کے سوا اب یہاں کیا ہوتا ہے	آج جو رنگ ہے وہ دیکھ کے دل روتا ہے
ہیں فقط باتیں ہی باتیں یہ عمل کچھ بھی نہیں	درس و تدریس کی حد تک ہیں عمل کچھ بھی نہیں
بجلیاں کوندتی ہیں سوئے وطن ہوش میں آ	غیرت قوم کے لئے جذبِ کہن جوش میں آ

تصدق



قلعہ گولکنڈہ

دکن ایک نگری

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں

عنوان کی پھبین کو دیکھ کر یہ اندازہ نہ لگا لیجئے گا کہ سارے کا سارا مضمون اسی انداز و آن بان کا ہے۔ کیونکہ ٹھوس اور بے کیف موضوع میں شعریت کا بہم پہنچانا اپنے بس کی بات نہیں۔ یوں بھی غزل کا کبھی صرف مطلع ہی مطلع ہوتا ہے اور ساری غزل محض بھرتی کی۔

آخر مجھے اس "پریم نگری" سے متعلق محبس کو سنسار والے دکن کہتے ہیں کیا کہنا ہے؟ کسی نے یہاں کے تاجدار شعراء پر قلم اٹھایا ہے، کسی نے مثنوی نگاروں پر تحقیقی کام کیا ہے، کسی نے مرثیہ نگار شعراء کا کھوج لگایا ہے کہیں کہیں تعمیراتی داغ بیل پڑی ہے، کہیں تعلیماتی ہلچل نمایاں ہے، اب بحث یہ آپڑی ہے کہ واقعی لکھیں تو کیا لکھیں۔ بہر حال ایک مذہبی فرض کی طرح، کچھ نہ کچھ لکھنا شاید ضروری ہے۔ کوئی موضوع ان شاطر لکھنے والوں نے چھوڑا بھی ہے جس پر خامہ فرسائی کی جائے؟ اور کبھی ایسے مکمل اور جامع موضوع پر لکھنا اپنا وتیرہ ہی نہ رہا۔ یہ تواضع میرے لئے محض بیکار ہے جس کا رجحان ہی تاریخی نہ ہو اس کے لئے یہ کتنی بڑی سزا ہے کہ اس سے کہا جائے کہ کسی طرح لکھنا ہوگا۔ خیر لے دے کے جب کوئی بات ہی نہ رہی تو محض اس کے نام کا تجزیہ ہی کر دیں گے۔ ہاں۔ تو اس دکن نگری نے جس کا کبھی بھاگ نگر بھی نام رہ چکا ہے اور جو اس کے "بھاگوان" ہونے کی بیّن دلیل ہے۔ کیونکہ مستقبل یوں بھی حال کا آئینہ ہوتا ہے اور نام کا کسی چیز پر بہت اثر پڑتا ہے۔ اس بھاگ نگر نے حیدر آباد، کا جنم لیا۔ نام میں شان و تمکنت آگئی۔ اس کے تقدّس کا پایہ بلند ہوگیا۔ حیدری عظمت و شکوہ نے بھاگ کے قسمت کو اپنے پرتو سے اجاگر کر دیا۔ لیکن "نگر" کا بانکپن اور شعریت ایک حد تک کم ہوگئی۔ اس لفظ میں جو مٹھاس ہے اور اس پر آبادی نے چھاؤنی ڈالدی۔ وہ کشش و گیرائی جو نگر، میں مضمر تھی آبادی نے چھین لی۔!! اب اگر

سمندِ تخیل ماضی کی طرف گام زن ہوتا ہے تو حال دامن تھام لیتا ہے۔ آخر کیا لکھا جائے؟ کیا ان چابکدست صنّاعوں کا ذکر کیا جائے جنھوں نے اپنے کمال فن کا نمونہ پتھر میں مورتیں تراش کر ایلورا واجنٹا جیسے نمار بھر دیئے۔ یا ان کا جنھوں نے اپنے فن مصوری کے اعلیٰ جوہر پتھروں کی لوح پر ہمیشہ کے لئے کندہ کرکے تاریخ کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ یا اس قلعہ کا ذکر کیا جائے جو گولکنڈہ کے نام سے شہرت پا چکا ہے جس کے قدیم ویران کھنڈر اس کی پرانی حشمت و شوکت کو دہراتے ہیں۔ جہاں کا چپہ چپہ زبانِ خاموشی سے گویا ہے۔ گذرے ہوئے خونیں افسانوں کی یاد جس کو دیکھ کر دل میں تازہ ہو جاتی ہے یا اُس ہیرے کا ذکر کیا جائے جو گولکنڈہ سے نکل کر آج تاجِ برطانیہ کی زیب و زینت بنا ہوا ہے۔ یا ان عمارتوں کے افسانے لکھے جائیں جن کی بنیادیں بجائے پتھر و چونے کے مشک و عنبر پر قائم کی گئی ہیں۔ یا اُن مدارس کا ذکر ہو جن میں ہزارہا طلبہ زیر تعلیم رہا کرتے تھے اور جن کے چرچے الحمرا، اور قرطبہ سے کچھ کم نہیں۔ ملک کا پاس، وفاداری کا جذبہ ان جیالوں کی سرفروشانہ کارگزاریوں سے سیکھا جا سکتا ہے جنھوں نے اورنگ زیب کی فاتح فوج کو قلعہ میں داخل ہونے سے روکا اور ایک ایک کر کے اپنی جانیں دیدیں۔ یا اس کا بے مثل نمونہ عبدالرزاق لاری جس نے اپنا آخری سانس تانا شاہ کے روبرو جان آفریں کے سپرد کر دیا۔ یہ وہ سرزمین ہے جہاں گاواں جیسے مدبر، گیسو دراز جیسے ولی، ابوالحسن تانا شاہ جیسے فرمانروا، ولی جیسا شاعر، وجہی و غواصی جیسے مایۂ ناز مفکر و ادیب گذرے ہیں۔ مکہ مسجد کا سنگ بنیاد رکھا جا رہا ہے، بادشاہ نے منادی کر دی کہ اس خانۂ خدا کا سنگ بنیاد وہی رکھے جس کی کوئی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی۔ اس ہجوم خلائق میں کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جو اس منصب جلیلہ کو انجام دے سکے جب کسی کی اتنی ہمت نہ دیکھی تو خود بادشاہ نے آگے بڑھ کر کہا کہ "میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ اب تک میری کوئی نماز قضا نہیں ہوئی"!

یہ وہ سرزمین ہے جہاں کی علمی ضیا پاشیوں نے حافظ شیرازی کے دل میں اس کے دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ مگر ان کا ارادہ بس ارادہ کی حد تک ہی رہا!

اس تہذیب و تمدن کے گہوارہ، علم و فضل کے مسکن کو عصر جدید کی برق رفتار ترقیوں نے اور چار چاند لگا دیے ہیں۔

وہی گذری ہوئی شان و شوکت پھر عود کر آئی ہے۔ اس دورِ میمنت لزوم کے عظیم الشان کارناموں کو دیکھ کر۔ ہمارے شاہ جمجاہ کی ذیشان ہستی اور اس مبارک وجود کی برکتوں پر شاہ جہانِ وقت کا دھوکہ ہوتا ہے۔ تاریخ خود کو دہرا رہی ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام دورِ عثمانی کا ایک زرّین و نمایاں کارنامہ ہے۔ یہ فنِ معماری کا حسین مرقع متعدد خوشنما وسیع و دلکش عمارتوں پر پھیلا ہوا ہے۔ آبادی سے دور، دنیا کے ہنگاموں سے پرے یہ گنجینۂ علم و ادب واقع ہوکر ہمارے شہر میں اپنی علمی و ادبی سرگرمیوں کو پوٹنگل کی طرح منتشر کر رہا ہے۔ اس سرچشمۂ علم سے فیض یاب ہونے کے لئے دور دور سے پیاسے آتے ہیں اور سیراب ہوکر چلے جاتے ہیں۔ اور پھر بذاتِ خود ایک چشمۂ فضل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ اس شمعِ علم کا ہر پروانہ اپنے قلب میں انوارِ علم کی ایک جھلک محسوس کرتا ہے۔

عثمان ساگر اور حمایت ساگر مسرت کے آنسوؤں سے لبریز دو خوبصورت آنکھیں ہیں جو دکن کے خد و خال کو اپنی زینت و دلاویزی سے نمایاں طور پر حسین بنا رہی ہیں۔ علی ساگر جنتِ ارضی کی ایک خوش آیند جھلک ہے۔ اس نگری کا ایک پہاڑی حصہ بنجارہ ہل، سے معنون تھا۔ جو اب سے چند سال پہلے بنجاروں کا مسکن رہ چکا ہے۔ یہی بنجارہ ہل اب جوبلی ہل" کہلاتا ہے۔ اس سنگلاخ پہنائی میں جتنی شعریت اور جتنا سکون ہے وہ شاید کسی آبشار کی قربت میں رہنے بسنے والوں کو نصیب ہو تو ہو۔ دکن کا یہ حسین جاذبِ نظر حصہ اپنی خوشنمائی اور بلندی میں ایک عجیب آن بان رکھتا ہے دکن کی آبادی سے پرے ہٹ کر اس کے غیر آباد اور اطراف و اکناف کے بھی جتنے ٹھکانے ہیں ان میں ہر دلعزیزی کی ڈہی فراوانی ہے جس طرف نکل جائیے جی چاہتا ہے کہ بس وہیں کے ہو جائیے بعض مقامات تو اتنے پرفضا ہیں کہ وہاں تپ دق کے مریضوں کا ایک ٹھکانہ بن سکتا ہے۔ اور پھر شاید یہ غریب مدن پلی یا میسور سینی ٹوریم کے محتاج نہ رہیں۔

آبادی کا رقبہ محلوں اور گلی کوچوں سے معمور ہے بعض گلیوں اور محلوں کے نام کچھ عجیب و غریب بے کیف و بے معنی سے ہیں اور جو یقینی اصلاح طلب ہیں۔ ایک قلمرو، ایک سلطنت یا ایک شہر کی تشبیہ ایک کتاب، ایک دیوان یا ایک جامع و مکمل رسالہ سے دیجاسکتی ہے جس کے بالعموم سب مضمون اچھے نہیں ہوتے لیکن اگر سب کے سب

اچھے ہو جائیں۔ اور یہ اپنے بس کی بات بھی ہو تو پھر اس کا مرقع و یگانۂ روزگار ہونا کونسی بڑی مہم ہے جو ہم سر نہیں کر سکتے۔

جوہری کے صندوق کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے ہر خانہ میں لعل و جواہر ہی ملیں گے۔ ادنی قیمت کی چیزوں میں شاید کبھی نکل آئے گی لیکن ٹھیکری نہ ملے گی۔

اب دیکھئے اسی دکن کے لئے اب سے ساڑھے تین سو برس پہلے دکن کا ایک واحد ادیب و شاعر کیا کہتا ہے۔

دکن سا نہیں ٹھار سنسار میں ۔۔۔ پنچ فاضلاں کا ہے اس ٹھار میں
دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ ۔۔۔ انگوٹھی کوں حرمت نگینا ہی لگ
دکھن ملک کوں دھن عجب ساج ہے ۔۔۔ کہ سب ملک سر ہور دکن تاج ہے (وجہی)

ایک دانائے تخیل کی نظر میں یہ ”سو ہے دکن کی نگری“

خدا اس کو چشم زخم سے بچائے اور یہ دور عثمانی رہتی دنیا تک قایم رہے۔ ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد۔

جہاں بانو

رُباعیات

ہستی سے ہے معمور زمانہ کب سے ۔۔۔ چلتا ہے جہاں کا کارخانہ کب سے
حیران ہوں کہ کیوں ختم نہیں ہوتا ہے ۔۔۔ ہے صرف میں قدرت کا خزانہ کب سے

اونچی ہے ہر اک اوج سے ہستی اپنی ۔۔۔ افلاک کے اس پار ہے بستی اپنی
دنیا نے بہت ہم کو ستایا لیکن ۔۔۔ اتری نہ ان ترشیوں سے مستی اپنی

لطیف النساء بیگم

دکن کی وحشی قومیں

ہمارے ملک میں بہت سی قومیں ایسی آباد ہیں جو وحشی سمجھی جاتی ہیں ایک زمانہ تھا کہ اُن سے شہری بہت ڈرا کرتے تھے کیونکہ وہ وحشی، نڈر اور جرائم پیشہ ہوتی تھیں۔ مگر اب ایسی بہت سی قومیں شہروں میں ایسی ہیں جہاں وہ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال لیتی ہیں۔ یہ لوگ بہت کچھ بدل گئے ہیں۔ پھر بھی لباس، زیور وغیرہ سے صاف پہچان لئے جاتے ہیں کہ یہ لوگ سب سے الگ ہیں۔

دکن کی اِن وحشی اور نیم وحشی قوموں میں مشہور یہ ہیں:۔ گونڈ، بھیل، وڈے وار، کلدم، پارڈی، لمباڑے وغیرہ۔ اِن میں اکثر گونڈ، وڈے وارہ، پارڈی شہروں میں بھی بسنے لگے ہیں جن میں گونڈ محنت مزدوری، وڈے وارہ، پتھر پھوڑنے وغیرہ کے کام کرتے ہیں پارڈی میوہ فروش ہیں، پرندے بھی بیچتے ہیں۔

ملک سرکار عالی میں بالخصوص ضلع عادل آباد میں وحشی اقوام یعنی بھیل، گونڈ، کلدم بہت موجود اور جنگلوں کو اپنا مسکن بنائے ہوئے ہیں۔ بھیل ضلع اورنگ آباد میں بھی آباد ہیں۔ اُن میں اکثر مذہب اسلام کے بھی پیرو ہیں۔ مگر بود و باش اُن کی جنگلوں ہی میں ہے۔ بھیل، کلدم ضلع عادل آباد میں آباد ہیں۔ میں اُن کے حالات مختصراً دلچسپی کے لئے درج کرتی ہوں، یہ لوگ عام لوگوں سے الگ تھلگ جنگلوں میں بستے ہیں جہاں جنگل کی کثرت ہوتی ہے وہی اُن کی پسندیدہ جگہ ہوتی ہے جہاں گھاس پھونس کی جھونپڑیاں بنا کر یہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ بہت غریب و مفلس ہیں۔ وہ چیزیں جو روپیہ پیسہ سے حاصل ہو سکتی ہیں، اُن سے یہ محروم ہیں۔ یہ بڑے اچھے شکاری ہوتے ہیں۔ زراعت پیشہ بھی ہیں مگر ہتھیار اور زراعتی آلات بھی اُن کے پاس نایاب ہیں۔ کپڑے بھی یہ لوگ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ درختوں کے پتے، چھال، جانوروں کی کھال سے اپنا کچھ جسم ڈھانک لیتے ہیں۔ عورتیں فطرتاً زیب و زینت کی خواہشمند ہوتی ہیں۔ غالباً زیور پہننے کا مقصد بھی

آرائش ہی ہوتا ہے۔ چنانچہ ان کی عورتیں بھی اکثر جنگلی درختوں کے بیجوں اور کلیوں کے ہار شوق سے پہنتی ہیں۔

یہ نڈر اور شکاری ہوتے ہیں لیکن بندوقیں وغیرہ ان وحشی بھیلوں کے پاس نہیں ہوتیں۔ یہ تیر و کمان سے شکار کر لیتے ہیں۔ ان کی تیریں بانس کی ہوتی ہیں۔ جسے خوب تیز اور نوک دار بنا لیتے ہیں اور شیروں سے مقابلہ کرنے سے بھی نہیں جھجکتے۔ ان کی بسر جنگلی جانوروں پر ہی ہے۔ ہر قسم کے جانور کھا جاتے ہیں۔ درندوں کا گوشت چٹ کر جاتے ہیں۔ اکثر لوگ زراعت پیشہ ہیں جو اپنی جھونپڑیوں کے اطراف زمین صاف کر کے نوکدار لکڑیوں سے ہل کا کام لیکر کچھ جوار وغیرہ بو لیتے ہیں۔

یہ لوگ بہت کم عمر میں اپنی اولاد کی شادی کر دیتے ہیں۔ دودھ پیتے بچے کی بھی ان کے ہاں شادی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ عقیدے کے بہت کچے ہوتے ہیں۔ نامعلوم دیوتاؤں، بتوں، روحوں، سانپوں کو پوجتے ہیں۔

ان کا خاندان اکثر ایک جگہ بستا ہے۔ لیکن اگر ان میں سے کوئی مر جائے تو اُس جگہ اور جھونپڑیوں کو منحوس سمجھ کر نقل مقام کر جاتے اور دوسرے جنگل میں جا بستے ہیں۔

یہ بھی ہماری طرح انسان ہیں۔ مگر تہذیب و تمدن سے ناآشنا علم و دولت سے محروم ہیں۔ اسی جہالت بے علمی مفلسی کی بناء پر ان کی یہ ہیئت کذائی ہے کہ ہم آپ دیکھیں تو اُن سے ڈر جاتے ہیں۔

کبریٰ اقبال عبدالرؤف

دورِ آصفی کے مثنوی گو شعراء

اُردو کو بامِ ترقی پر پہونچانے کا سہرا خاص کر حیدرآباد ہی کے سر ہے۔ سلاطین قطب شاہی نے اس کی سرپرستی کر کے اس کو اوجِ ترقی پر پہونچایا تھا تو سلاطین آصف جاہی نے اس کی ہمت افزائی کا بیڑا اٹھایا۔ دورِ آصفی کے مشہور فرمانروا نے اس کو وسعت دینے میں ہر قسم کی ممکنہ کوشش کی اور کر رہے ہیں۔

مثنوی اصنافِ سخن میں سب سے زیادہ مفید اور کارآمد صنف ہے کیونکہ غزل یا قصیدے میں اس وجہ سے کہ اول سے آخر تک ایک قافیہ کی پابندی ہوتی ہے ہر قسم کے مُسلسل مضامین کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ مسدس۔ ترجیع بند۔ ترکیب بند، غرض جتنی صنفیں فارسی اور اُردو شاعری میں مروج ہیں ان میں کوئی صنف مسلسل مضامین کے بیان کرنے کے قابل مثنوی سے بہتر نہیں۔ یہی وہ صنف ہے جس کی وجہ سے فارسی شاعری کو عربی شاعری پر ترجیح دی جاسکتی ہے عربی میں مثنوی کا رواج نہ ہونے کے سبب تاریخ یا قصہ یا اخلاق یا تصوف میں ظاہرا ایک کتاب بھی ایسی نہ لکھی جاسکی جیسی فارسی میں سیکڑوں بلکہ ہزاروں لکھی گئی ہیں۔ اس لئے عرب شاہنامہ کو "قران العجم" کہتے ہیں اور اسی لئے مثنوی معنوی کی نسبت "ہست قراں در زبان پہلوی" کہا گیا ہے۔

اس طفل نو مولود نے اپنے تجربہ کار ہم عصروں کے قدم بقدم چلنے کی حتی المقدور کوشش کی ایک حد تک اس کو کامیابی بھی ہوئی مگر اس کے شعراء فارسی کے شعراء کا اس صنف میں مقابلہ نہ کر سکے۔ ان کی مثنویاں صرف عشقیہ مضامین ہی تک محدود رہیں۔ مقابلہ نہ کر سکے۔ ان عشقیہ مضامین میں بھی جنوبی ہند کے مثنوی گو شعراء کا شمالی ہند کے مثنوی گو شعراء مقابلہ نہ کر سکے چنانچہ دکن کے ادبی آسمان پر ایسے ستارے چمکے جو اپنی دھیمی دھیمی روشنی سے ادبی دنیا کو منور کر گئے۔

ذیل میں انہیں شعراء کا ذکر کیا جائے گا جو دورِ آصفی سے تعلق رکھتے ہوں۔

سراج ۔ سراج الدین نام سراج تخلص اورنگ آباد کے ساداتِ صحیح النسب سے تھے ۱۱۲۷ھ میں تولد ہوئے ۔ دکن کا مشہور صوبہ جہاں اُردو کے باوا آدم نے جنم لیا وہی سراج کا وطن تھا ۔ اس زمانہ کا اورنگ آباد شان و شوکت میں بے نظیر تھا سونے پر سُہاگہ یہ کہ وہ عالمگیر مرحوم کا پائے تخت تھا ۔ اسی وجہ سے مرجع اہلِ کمال بنا ہوا تھا ۔ ہر علم و فن کے اہلِ کمال وہاں جمع تھے ۔ انھیں کے دامنِ عاطفت میں ولی کے جانشین شاعر نے تربیت پائی ۔

میر تقی میر اور میر حسن کا خیال ہے کہ سیّد حمزہ سے ان کو تلمذ حاصل تھا ۔ مگر یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے کسی کے سامنے زانوئے شاگردی طے نہیں کیا ۔

عنفوانِ شباب میں غلبۂ شوق سے از خود وارفتگی کی کیفیت پیدا ہوئی ۔ سات برس تک برہنہ پا و برہنہ سر مولانا برہان الدین کے روضہ کے اطراف چکر کاٹتے رہے اور اسی حالتِ مستی میں فارسی میں شعر کہتے مگر لکھتے نہ تھے خود فرماتے ہیں کہ اگر اس زمانے کے اشعار جمع کئے جاتے تو ایک ضخیم دیوان تیّار ہو جاتا ۔

سات برس گزرنے پر سیّد عبد الرحمٰن چشتی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے ہاتھ پر طریقہ چشتیہ میں بیعت کی اور عرصہ دراز تک ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے ۔

اپنے پیر بھائی عبد الرسول کے کہنے پر ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی ۔ پھر اس ریختہ گوئی میں ایسے چمکے کہ کوئی ان کا مقابلہ نہ کر سکا ۔ مصنف گلِ رعنا کا بیان ہے کہ دکن میں ولی کے بعد سراج کے پایہ کا کوئی شاعر نہیں گزرا [2] ۔

چار سال کے عرصہ میں انھوں نے ایک ضخیم دیوان مرتب کیا جس میں پانچ ہزار شعر ہیں اور اس میں ردیف وار غزلیں ۔ مثنویاں ۔ مخمس ۔ ترجیع بند ۔ رباعیات سب کچھ شامل ہیں ۔ مضامین کی شگفتگی خیالات کی بلند پروازی اور سادگی ایسی چیزیں ہیں جن سے حیرت ہوتی ہے کہ دو سو تیس سال قبل کا شاعر کس طرح زمانۂ موجودہ کی زبان کو استعمال کر گیا ۔

۴ شوال بروز جمعہ ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی ۔

---

[1] دکن میں اُردو

[2] گلِ رعنا صفحہ (۱۰۹)

ایک دیوان ۔ کلیات اور ایک مثنوی بوستان خیال اپنی یادگار چھوڑی ۔ یہ مثنوی سنہ ۱۱۷۳ھ میں لکھی گئی جس میں گل و بلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی گئی ہے ۔

ان کی زندگی میں ہی ان کا کلام مقبول عام ہو گیا تھا ۔ ان کا کلام ایک طرف مجلس سماع میں صوفیا کو روحانی غذا بہم پہونچاتا تھا تو دوسری طرف باکمال شعرا کے لئے رشک کا باعث تھا ۔

عزلت[1] ۔ میر عبدالولی نام ۔ عزلت تخلص ۔ سید سعد اللہ سلونی کے بیٹے اور شاہ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے ۔ سنہ ۱۱۰۴ھ میں سورت میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی ۔ باپ کی وفات کے بعد دہلی گئے جہاں انھوں نے کئی علمائے سے ملاقاتیں پیدا کیں اور یہیں انھیں ریختہ شاعری کا خیال پیدا ہوا ۔ اس کے بعد اورنگ آباد ۔ دہلی ۔ مرشد آباد ہوتے ہوئے پھر دوبارہ اورنگ آباد آئے اور اسی کو اپنا وطن بنالیا ۔ نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر نے انھیں تنخواہ مقرر کر دی ۔ ان کی شہادت کے بعد حیدرآباد آئے ۔ نواب صلابت جنگ آصف الدولہ بہادر نے دو گاؤں جاگیر میں عنایت فرمائے ۔ غرض جب تک زندہ رہے فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کی ۔

خطاطی ۔ موسیقی ۔ مصوری اور شاعری میں ان کو بڑا کمال حاصل تھا ۔ جامعیت اور ہمہ دانی میں اپنے بہت سے نامی ہم عصروں سے ممتاز تھے ۔ اسی وجہ سے جہاں جاتے قدر شناس ان کی عزت کرتے تھے ۔ ۱۶ رجب سنہ ۱۱۸۹ھ[2] میں وفات پائی ۔ حیدرآباد میر مومن کے دائرہ میں مدفون ہوئے ۔ مگر مصنف "یورپ میں دکھنی مخطوطات" نے ان کا سن وفات سنہ ۱۱۹۸ھ[3] بتلایا ہے ۔

ان کی ایک مثنوی راگ مالا ہے ۔ اس مثنوی کے ابتدائی چند اشعار تمہید کے ہیں ۔ اس کے بعد چھ راگوں کے نام کی تفصیل اور اس کے بعد کے راگوں کی وضاحت کر کے اول بھیرون کو شروع کیا ہے اس کے بعد بھیرون کے اقسام بیان کئے ہیں اس کے بعد اسی طرح دیگر راگ اور اس کے بعد اس کے اقسام کا ذکر ہے ۔

خدا نے جب تنِ آدم بنا کر　　　کہا اے روح تو جا اس کے بھیتر

---

[1] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ (۵۱۸)　　[2] گل رعنا صفحہ (۹۷)　　[3] یورپ میں دکھنی مخطوطات صفحہ (۵۱۸)

کیا عرض او کر روح نے یوں ؟ — اندھیری کوٹھری میں جاؤں میں کیوں
کہا تب اک ملک کو بیٹھ تن میں — تو بول ایک راگ آدم کے تن میں
ملک سے سن کے تانیں درد کی گئی — دوانی ہو کے تن میں روح آگئی
مرصع تخت پر بیٹھا جوان ایک — کہ دولت اور طرب کا کامراں ایک
قبا سبز اس کے روشن تھا نمایاں — تعجب ہرا کا تھا گل سر ریحاں !
اور اس کے گود میں تھی ایک پری رو — منہ اس کا فتنہ خیز اور زلف جادو
ہوا عزلت کا یا دِ حق تعالی — کہا اتمام نظم راگ مالا

عاجز۔ عارف الدین نام عاجز تخلص تھا۔ ان کے باپ دادا بلخ کے باشندے تھے۔ عالمگیر کے عہد میں ان کے دادا بلخ سے ہندوستان آئے تھے۔ نواب فیروز جنگ کی عنایت سے انھیں شاہی منصب عطا ہوا۔ عزلت دکن میں پیدا ہوئے۔ بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر نواب نصرت جنگ سید لشکر خان نے انھیں اپنی سرپرستی میں لے لیا۔ انھیں کے سایۂ عاطفت میں تربیت پائی اور انھیں کے ساتھ اورنگ آباد آئے۔ یہاں انھیں کے توسط سے دربار آصف جاہی میں باریاب ہوئے۔ منصب عطا ہوا۔ فوج کے بخشی قرار پائے۔

مزاج میں ظرافت اور شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا۔ اورنگ آباد دیکھ کر شوق بڑھ گیا فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے کرتے دونوں زبانوں میں کافی مہارت حاصل کر لی۔ اور دونوں زبانوں میں بہترین شعر کہا کرتے تھے۔ تاریخ گوئی کا خاص ملکہ تھا۔

سنہ ۱۱۷۸ھ میں وفات پائی۔ ان کی وفات کا عجیب قصہ ہے۔ کبرسنی میں ایک مرتبہ بیمار ہو گئے تو نواب موسوی خان سے کہلا بھیجا کہ میں مرتا ہوں تاریخ کی فکر کیجئے۔ انھوں نے جواب دیا کہ تاریخ گوئی میں آپ کے سامنے میری کیا چلتی ہے۔ آپ ہی تکلیف کیجئے۔ یہ سن کر اپنے نام و تخلص کے اعداد جمع کئے ایک عدد بڑھتا تھا۔ فرمایا کہ

کاش ایک سال کی اور مہلت ملجاتی تو نام کا نام اور تاریخ کی تاریخ ہو جاتی۔ قدرت کا کرشمہ دیکھو دو چار روز میں اچھے ہوگئے بعد از صحت یابی کسی کام سے نانڈیڑ گئے وہاں چند روز رہنے کے بعد وفات پائی۔ نانڈیڑ ہی میں مدفون ہوئے۔ عارف الدین خان عاجز سے ان کے وفات کی تاریخ نکلتی ہے۔

ایک دیوان فارسی و اردو یادگار چھوڑا اور ایک مثنوی لعل و گوہر لکھی۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قصہ ملکہ مصر و لعل و گوہر کا مصنف ایک ہی تھا مگر جاننا چاہیئے کہ ولی کی طرح دکن میں عاجز تخلص کے بھی متعدد شخص ہوئے ہیں۔ ایک عاجز تو وہ سید محمد ہے جو قصہ ملکہ مصر کا مصنف ہے دوسرے یہ عارف الدین عاجز ہیں جنھوں نے لعل و گوہر تصنیف کی ہے۔

قصہ لعل و گوہر ایک فارسی قصہ کا ترجمہ ہے اس کا سن تصنیف معلوم نہیں مگر قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۱۵۰ھ کے بعد اور سنہ ۱۱۸۰ھ کے پہلے لکھی گئی ہے۔ یہ مثنوی سنہ ۱۸۷۳ء میں مدراس سے اور سنہ ۱۸۷۷ء میں بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

مثنوی میں پہلے حمد و نعت ہے اس کے بعد عشق کی تعریف کی گئی ہے۔ اس کا قصہ اندر سبھا کے قصے کے طرز پر لکھا گیا ہے یعنی ایک بادشاہ کا لڑکا سو رہا تھا۔ پریوں کا تخت جا رہا تھا۔ ایک پری شہزادہ پر عاشق ہو گئی اور اس کے پلنگ کو اٹھا منگوایا۔ ایک مدت کی حیرانی اور پریشانی کے بعد دونوں کی شادی ہوئی اور وطن کو واپس ہوئے۔

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:-

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی　　عطا کر مجھ کو یاقوت معانی
سخن کا لعل دے میری زباں کو　　درِ معنی سے بھر میرے بیاں کو
سخن کے در کا مجھ کو جوہری کر　　سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
کیا تھا ملک بنگالے میں خسرو　　زمین عشق تھا اس کا قلمرو
ہمایوں تخت اور صاحب قراں تھا　　جہانگیروں میں وہ شاہ جہاں تھا

بہادر شاہ با تدبیر تھا وہ　　　رفیع القدر عالمگیر تھا وہ
سخاوت میں وہ تھا حاتم سا مشہور　　　شجاعت میں وہ تھا رستم سا مغرور
جو کچھ دنیا میں ہے اس کا دو چنداں　　　تھا اس کی کشور بخشش کا ساماں
رگِ ابرِ اجل تھی اس کی تلوار　　　عدو کا دم تھا اس کے ڈر سے خوں بار
زمرد شاہ تھا اس شاہ کا نام　　　تھا اس کے نام سے ہر دل کو آرام
دیا تھا حق نے اس کو خوب فرزند　　　زمرد سے کیا تھا لعل پیوند

وجدی ۔ وجدی بارھویں صدی کا مشہور مثنوی گو شاعر ہے ۔ اس کا سب سے مشہور کارنامہ شیخ فریدالدین عطاؔ کے منطق الطیر کا ترجمہ ہے جس کو وجدی نے ۱۱۵۵ھ میں ترتیب دیا ۔ اس ترجمہ کا نام "پنچھی باچھا" یا "پنچھی نامہ" ہے ۔ نمونہ پنچھی نامہ :-

اے پنچھی پیارے سخن آغاز کر　　　حمد سوں حق کی بلند آواز کر
شوق سوں ایسا او چایا یک چھجا　　　جو رہی ترلوگ کا عالم لوبھا
گلشن وحدت ہے تیرا آشیاں　　　احدیت کا راز سب تجھ پر عیاں

ان کی ایک اور مثنوی ۱۱۵۴ھ میں مرتب ہوئی ۔ نمونہ مثنوی :-

دنیا میں رہ کے دنیا سوں جدا اچھ　　　جدا ہو کر طلبگارِ خدا اچھ
قلندر ہو کے سٹ دے خود پرستی　　　دیوانا ہو کہ دکھلا جوش مستی
شرابِ عشق سوں کر دل کو توں مست　　　پکڑ لے نیستی نہ ہوئے گا ہست
مرادِ دل سمجھ لے نامرادی　　　کہ غم سوں پائے گا توں راہ شادی

شہاب الدین ۔ مولانا شہاب الدین نام تھا ۔ انھوں نے ۱۱۵۵ھ میں ایک ضخیم مثنوی سید محمد جونپوری کے

حالات میں لکھی مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو :۔

کہتے ہیں صادقاں سول یوں لولاک جنوں کوں حق کیا روزی ہدایت
تولد جب ہوا وہ شاہِ لولاک اتھا الایس خون سیں بدن پاک
مطہر تھا بدن اس کا سراسر شفق میں جیوں اچھے پاکیزہ چندر

نوازش علی ۔ اصلی نام نوازش علی شیدا ہے سنہ ۱۱۸۰ھ میں اعجاز عشق نام ایک مثنوی تصنیف کی جس کی دو جلدیں ہیں یہ دونوں جلدوں میں بھی آنحضرتؐ کی سوانح حیات کو رقم کیا ہے ۔ زبان شستہ اور صاف ہے ۔ نمونہ کلام :۔

لکھے راویاں ہے روایت صحیح میں کرتا بیاں ہوں سنو تم صریح
کہ بیٹھے تھے ایکدن امام رسول مہاجر و انصار حاضر تھے کل
یہودی اک آتا ہے با احتشام تھا نام اس کا عبداللہ بن سلام
شرافت میں اس سا نہ تھا دوسرا اتھا عقل میں علم میں وہ رسا

واقف ۔ آپ کا نام واقف تھا مگر آپ کو واقف دکھنی کہا کرتے تھے سنہ ۱۲۲۰ھ میں ایک مثنوی چندر بان نامی لکھی ۔ انھوں نے اس کو فارسی سے اردو میں ترجمہ کیا ۔ زبان شستہ اور خیالات پاکیزہ ہیں ۔ نمونہ ملاحظہ ہو :۔

کرم سے لپنے اے ساقیٔ وحدت پلا مجھ کو تو صہبائے محبت
آساقی دے مجھے جام طہورا کہ تا دیکھوں خدائی کا ظہورا
ہوا اس کی نشہ سے مست و سرشار رہوں ہر آن تیرا محو دیدار
مجھے رکھ ہر گھڑی تو مست و مخمور کہ دیکھوں تا میں تیرا جلوۂ نور

قربان حسین ۔ اسم گرامی سید قربان حسین تھا ۔ آپ حاجی بھی تھے سنہ ۱۲۵۰ھ میں ایک مثنوی جنگ نامہ امیر حمزہ کے نام سے لکھی ۔ الفاظ کی بندش خیالات کی روانی کے لحاظ سے یہ مثنوی بہترین ہے ۔

مثنوی کے چند شعر ملاحظہ کیجئے :-

شہنشاہ کی بیٹی تھی اس مہار — انھا نام اسے جگ میں مہر نگار
امیر کی شجاعت کو سن جگ منے — انھی بھوت حمزہ پو عاشق اَنے
کہتی تھی ایک آدے سون یک ماجرا — انھا نام اس کا جو خواجہ سرا
اسے دیکھ حمزہ کو اس موضع پہ — کیا شاہ زادی کو جلدی خبر

نظم طباطبائی ۔ نواب حیدر یار جنگ علی حیدر نظم طباطبائی حیدرآباد کے ایک بہترین شاعر تھے جن کی وفات کا صدمہ ابھی لوگوں کے دلوں سے محو نہیں ہوا ہے ۔ انگریزی اشعار کا ترجمہ کرنے میں آپ بے مثل ثابت ہوئے ہیں گرے کی مشہور " ایلی جی " کا ترجمہ آپ نے " گورِ غریباں " کے نام سے کیا ہے ۔ آپ کے کلام میں روانی برجستگی پائی جاتی ہے ۔ بقول ہاشمی صاحب " الفاظ کی تازگی سے کلام میں نگینے جڑے ہوئے معلوم ہوتے ہیں "۔ قصیدہ آپ کی پسندیدہ صنف تھی اسی وجہ سے آپ نے اور اصناف سے زیادہ اس صنف کو اپنے خیالات کا آلہ بنایا ۔ چند ایک مثنویاں بھی لکھی ہیں ۔ ایک مثنوی کا نمونہ ملاحظہ ہو :-

ابر پانی کہاں سے لاتا ہے — کیا سمندر سے پی کے آتا ہے
برق و باراں میں لاگ کیسی ہے — اور یہ پانی میں آگ کیسی ہے
مہر و ماہ کا گہن یہ کیسا ہے — آسماں پر چمن یہ کیسا ہے
گھٹتی بڑھتی ہے قوسِ لیل و نہار — چرخ چارم ہے یا زمین دوار
جب سمجھ میں ہی کچھ نہیں آتا — دم تمھارا نہیں ہے گھبراتا

تم پہ واجب ہے کسبِ علم و فنون
نہ کہ یہ مستی و شراب و جنون

شاد۔ آپ کا اسم مبارک مہاراجہ سرکشن پرشاد بہادر ہے۔ زمانۂ حال کے ممتاز و مشہور شاعر ہیں۔ دلی کے ایک قدیم و معزز خاندان سے آپ کا تعلق ہے۔ آپ کے نانا کونسل آف ریجنسی کے (جو میر محبوب علی خان بادشاہ کے زمانہ میں قائم ہوئی تھی) ایک رکن تھے۔ اور انھوں نے ان کو زبان عربی و فارسی کی اچھی تعلیم دلوائی تھی۔ علاوہ ازیں آپ کو انگریزی تلنگی اور مرہٹی زبانوں میں کامل دستگاہ ہے۔ آپ عربی و فارسی، اردو نہایت صفائی سے لکھتے ہیں شاد تخلص فرماتے ہیں۔ آصف کے شاگرد ہیں۔ نانا کی طرف سے آپ کو فن شاعری ورثہ میں ملا ہے۔ نانا کی طرح آپ کا کلام بھی صوفیانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ آپ شعر و سخن کے دلدادہ ہیں۔ علم کی سرپرستی آپ کا خاص شعار ہے آپ کے پاس ہر وقت علم و فن کے مباحثے اور شعراء کی مجلسیں منعقد ہوا کرتی ہیں اور اس سے آپ کی بے تعصبی اور ارتقاءِ مذہب کا پتہ چلتا ہے۔ سخاوت اور کرم و عنایت میں بھی آپ اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں چالیس تصنیفات کے مصنف ہیں۔

آپ کو جملہ اصناف نظم میں کامل دستگاہ حاصل ہے۔ غزل، مثنوی، قصائد، قطعات، رباعیات وغیرہ آپ کے مشہور ہیں۔ آپ کے کلام میں ایک خاص قسم کی روانی پائی جاتی ہے۔ نزاکتِ خیال و لطافتِ بیان سے کلام کی خوبی دوبالا ہوگئی ہے لیکن یہاں صرف آپ کی مثنوی کو دکھلانا مقصود ہے۔ نمونہ مثنوی :-

ساقی دے جامِ ارغوانی　　جس سے ہو امنگ پر جوانی
لا جلد پلا دے دیر کیا ہے　　رندوں کے لئے سبھی روا ہے
طاقت نہیں مجھ کو کر توانا　　خم منہ سے لگا نہ کر بہانا
اس وقت وہ صبح دلکشا ہے　　پھولوں کی بہار جانفزا ہے
نکہت سے ہے گلوں کی روح پرور　　ہے آج مشامِ جاں معطر
آمادہ ہوں آج کچھ لکھوں میں　　مدحِ خواجہ میں کچھ کہوں میں

لازم ہے مجھ کو نغمہ سنجی رکھتا ہے یہ آرزو مراجی
ممدوح کی مدح لکھ رہا ہوں مداحِ حبیبِ مصطفےٰ ہوں

ضامن ۔آپ کا اسمِ گرامی سید محمد ضامن ہے ۔ضامن تخلص کرتے ہیں ۔آپ حیدر آباد کے رہنے والے ہیں آپ کی شہرت سے سب کے کان آشنا ہیں ۔آپ کا ایک دیوان شایع ہو چکا ہے ۔آپ رسالہ لسان الملک کے ایڈیٹر بھی ہیں ۔آپ نے لارڈ ٹنی سن "ملک الشعرا انگلستان کی مشہور و معروف مثنوی "اینک آرڈن" کا ترجمہ تسہید وفا کے نام سے کیا ہے ۔نمونہ کلام :۔

ڈھارس کی یہ گفتگو ہوا کی چپکی وہ غمزدہ سنا کی
دل کو ہر طرح سے سنبھالا امید پر غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا
اینک کرنے لگا نصیحت جیسی ہے سپاہیوں کی عادت
اللہ کا آسرا بتایا تسلیم و رضا کا ذکر لایا
خاموش رہی کہا نہیں کچھ کچھ اس نے سنا سنا نہیں کچھ
جیسے کوئی گاؤں کی البیلی بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی
رکھ خالی گھڑا تہہ آب خود بحرِ خیال میں ہو غرقاب
ہو پیشِ نظر وہ بار جانی پھر کے اسے دیتا تھا جو پانی
حتیٰ کہ گھڑا بھرے چھلک جائے لیکن یہ سنے بھی اور نہ سن پائے

چند تذکرے یاد جن سے مصنف کے حالات پر کچھ روشنی نہیں پڑتی چھوڑ دی گئی ہیں۔

صفیہ صدیق فریدہ

دورِ عثمانی کا احسان خواتین پر

شاہِ ذیجاہ شہریارِ دکن و برار خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ سنہ ۱۹۱۱ء مطابق سنہ ۱۳۲۱ ف میں سریر آرائے سلطنت ہوئے اور آپ کا عہد خجستہ مہد حیدرآباد کے لئے مژدۂ جوان بختی و پیام ترقی لایا۔

عہدِ عثمانی کی ستائیس سالہ ہمہ گیر ترقیاں آسمانِ شہرت پر آفتاب تاباں کی طرح ضوفگن ہیں۔ کوئی محکمہ کوئی شعبہ کوئی فن کوئی ہنر کوئی فریق کوئی صنعت نہیں جو شاہ گرامی کی نظرِ اصلاح و ارتقاء سے محروم رہی ہو۔ قدیم و جدید تمام سررشتوں میں ترمیم و تنظیم کی ایک روح کارفرما ہے۔ محکمہ جات تعلیمات، تعمیرات، تجارت صنعت و حرفت، زراعت، فینانس، مالگزاری، عدالت، کوتوالی، فوج، وضع قوانین، اُمور مذہبی، امداد باہمی، امور دستوری، بلدیہ، آثار قدیمہ، معدنیات، ریلوے، ٹیلیفون، ٹپہ، ایرسروس، برقی، لاسلکی، طباعت، باغات، ہر محکمہ اصولاً و جزاً شاہراہِ ترقی پر گامزن ہے۔

منجملہ علمی، تمدنی، اقتصادی، معاشرتی ترقیوں کے حیدرآباد میں طبقۂ نسوان کی تعلیمی ترقی، احساسِ بیداری، ہر جہتی شوقِ عمل، کاروباری جد و جہد منت پذیر احسان خسروی ہے۔

چہ خوش نوید بہ مستاں دریں زمستان است مئے دو آتشہ در ہر مقام ارزان است

سلطان العلوم کے عطا پاش دورِ حکومت سے قبل مستورات کی تعلیمی و تمدنی جو حالت تھی اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ مزید ذکر محض خامہ فرسائی ہے۔

حضرت بندگانعالی کی فطرت شناس حقیقت رس نگاہیں جنسِ لطیف کی سقیم حالی پر متوجہ ہوئیں۔ وسائلِ تعلیم کے عام اور سہل الحصول ہونے، مواقع کارکردگی کے میسر آنے کی وجہ سے ان میں سعی و اکتساب کی روح، روشن خیالی

اقدامِ عمل کی اسپرٹ پیدا ہو گئی۔ طبقۂ اُناث کے لئے بھی قریب قریب وہی سہولتیں بہم پہنچائی گئیں جو جنسِ ذکور کے لئے مخصوص تھیں۔ مستورات کی تعلیم اسی قدر ضروری ہو گئی جس قدر فریقِ مقابل کی سمجھی جاتی تھی۔

خواتین کو بھی اپنی مخفی قوتوں کو عملی جامہ پہنانے کے مواقع نصیب ہوئے۔ علمی مرکز سے گزر کر عملی دائرہ میں داخل ہونے لگیں۔

تعلیم و تدریس میں خصوصاً اور دیگر فنون مثلاً ڈاکٹری، کمشنری، ادارت وغیرہ میں بھی انہیں حصہ لینے کے موقعے حاصل ہوئے۔

جنسِ نسواں کی تعلیمی، تمدنی، معاشرتی، عمرانی، اقتصادی، اخلاقی ترقی سے جذباتِ مسرت اور اپنے بادشاہ جم جاہ کے ساتھ تاثراتِ تشکر نے جشنِ سیمیں مبارک کے موقع پر اس نظم کا قالب اختیار کیا اور اس تقریبِ مسعود کی یادگار میں جو محبوبیہ گرلز اسکول میں منائی گئی تھی اس کو سنانے کی سعادت حاصل ہوئی۔

نذرِ بے حقیقت

کھلے غنچے ہوئی رنگیں فضا فصلِ بہار آئی — حسینانِ چمن کو زیورِ گل سے سنوار آئی
نسیمِ روح پرور مست، مثلِ مے گسار آئی — مشامِ جاں معطر ہے ہوائے مشکبار آئی

مچی ہے دھوم ہر سو نوجوانانِ گلستاں میں
"بہار آئی" "بہار آئی" کا آوازہ ہے بستاں میں

مسرت سے ہیں خود آمدِ فصلِ بہاری پر — ہوئے مشغولِ عشرت مژدۂ جاں بخش کو سنکر
بھری ہے اک امنگ دل میں سبھی کے انگ انگ — زباں پر نغمۂ شادی، ترانے لب پہ جاں پرور

پڑا ہے غلغلہ ہر چار سو ہنگامِ سور آیا
شہِ ملکِ دکن کا جشنِ سیمیں پُر سرور آیا

مہِ نو ساتھ لیکر بادۂ فرخ فال آیا ہے — دکن کا کوکبِ طالع سرِ اقبال آیا ہے

مبارک جوبلی کا یہ مبارک سال آیا ہے   بصد شوکت بصد حشمت بصد اجلال آیا ہے

ہے بست و پنج سالہ یادگارِ عہدِ زریں یہ
رعایائے دکن کو ہو مبارک جشنِ سیمیں یہ

نظام الملک آصف جاہ سابع خسروِ ذیشان   سپہرِ آصفی کے نیرِ اعظم جہہ تاباں
دکن کے فخر، عالم میں ممیز نامور سلطان   امیر المومنین عثمان علی خان رحمتِ یزداں

ترا عہدِ عدالت مہد ہے پیغام آبادی
عطا کی نفسِ انسانی کو جائز تو نے آزادی

بیاں کیونکر کروں جذبِ ارادت جوشِ دل اپنا   میں کھینچوں اپنے جذباتِ دلی کا کس طرح نقشہ
کہ ہم نے عہدِ زرّیں دورِ عثمانی میں کیا پایا   خواتینِ دکن کو کیا دیا ہے تو نے سرمایا

رواں تھی جوئبارِ علم لیکن تشنہ لب تھے ہم
کیا فیضانِ رحمت نے ترے، سیراب و تازہ دم

بہائے علم کے دریا تیرے دستِ سخاوت نے   کھلے بابِ ترقی جنبشِ انگشتِ معجز سے
بٹھایا چرخ پر خاکِ مذلت پر پڑے جو تھے   مساوی کر دیا ذروں کو گویا مہرِ انور کے

خواتینِ دکن ممنونِ احساں ہیں ترے تنہا
نکالا جہل سے، سرمایۂ علم و ہنر بخشا

برائے شکریہ حاضر ہوں تیرے آستانہ پہ   سراسر رہنِ منت اور سرتاپا زباں بن کر
یہ نذرِ بے حقیقت نذر ہے شاہِ ہنر پرور   ترے ہی نامِ نامی کا نگیں کندہ ہے سینہ پر

صداقت کیش دل ہر دم، خلوص انگیز جاں ہر دم
دعا اندوز لب ہر دم، سپاس آگیں زباں ہر دم

مبارک بزم جم جام طرب شاہ گرامی کو — چھلکتا ساغر عیش و مسرت یہ پیاپے ہو
مبارک نغمۂ بہجت مبارک مطرب خوش گو — مبارک ماہ فروردی مبارک سال نو تجھ کو

مبارک جشن سیمیں محفل شاہی مبارک ہو
الٰہی جشن زریں جشن الماسی مبارک ہو

رہے جب تک جہاں قائم کرے عثمان جہانبانی — رہے اولاد شہ آسودہ زیر ظل سلطانی
مناصب میں ہو اعظم جاہ ذیشاں کے فراوانی — معظم جاہ والا شان کی شوکت میں ارزانی

در شہوار رہو تابندہ گوہر تاج خسرو پر
چمن میں شاہ کے یارب رہے شگفتہ نیلوفر

رہے جب تک کہ گردش گنبد گردوں اخضر میں — رہے جب تک ضیا انجم میں، مہ میں شاہ خاور میں
رہے جب تک مہک غنچے میں شادابی گل تر میں — رہے جب تک کہ جوش و ولولہ مرغ نوا گر میں

دعا ہے رابعہ کی یا الٰہی یہ دل و جاں سے
رہے آباد عالم میرے آقا شاہ عثماں سے

رابعہ بیگم انوار اللہ

عہد عثمانی میں عورتوں کی ترقی

عہد عثمانی میں جہاں مردوں نے تعلیمی اور معاشرتی طور پر ترقی کی ہے وہاں عورتوں کی بھی تعلیمی اور معاشرتی حیثیت میں نمایاں ترقی ہوگئی ہے ۔ ہم پہلے تعلیمی ترقی پر غور کریں گے ۔

اب سے کوئی تیس سال پہلے بی ۔ اے تو کجا میٹرک پاس خواتین بھی نہیں مل سکتی تھیں لیکن آج خواتین نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ بہت سی بی ۔ اے بلکہ ایم ۔ اے بھی ہیں سرکاری وظائف کی وجہ سے کئی ایک ولایت کی تعلیم یافتہ بھی ملیں گی ۔

نامپلی اسکول اور محبوبیہ اسکول پہلے ہی قائم ہو چکے تھے مگر اب ان کی تعلیمی حالت پہلے سے کہیں بہتر ہے ۔ اور طالبات کی تعداد بھی پہلے سے بہت زیادہ ہوگئی ہے ان اداروں کی خصوصیات یہ ہیں کہ یہاں صرف تعلیم ہی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی ہے بلکہ لڑکیوں کی تربیت اور ان کی سیرت اور کردار کی نشو و نما کی بھی نگرانی کی جاتی ہے جس کی وجہ سے توقع ہے کہ ہماری آئندہ نسلیں زیادہ ترقی یافتہ نکلیں گی ۔ یہاں کی پاس شدہ لڑکیوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کا انتظام کلیہ اناث کی شکل میں کیا گیا ہے ۔ جہاں ام ۔ اے اور ام ۔ ایس ۔ سی تک تعلیم دیجاتی ہے ۔

یہ تو بڑے مدارس ہیں لیکن بہت سے چھوٹے چھوٹے مدارس بھی حیدرآباد کے تقریباً ہر ایک محلے میں قائم ہوگئے ہیں اور اضلاع میں بھی ہر ضلع بلکہ ہر تعلقہ میں زنانہ مدارس قائم ہیں ۔

معاشرتی حیثیت سے بھی ہماری حالت میں ایک انقلاب ہوگیا ہے پہلے کی بہ نسبت رسم و رسومات کی پابندیاں بہت کم ہوگئی ہیں مثلاً شادی بیاہ کے معاملے ہی کو لیجئے کہ پہلے شادیوں میں کتنی فضول اور تکلیف دہ رسومات ہوتی تھیں ۔ عقد کے ایک مہینہ پہلے سے شادی شروع ہوجاتی تھی اور ایک مہینہ بعد جاکر کہیں ختم ہوتی تھی ۔ میزبانی کرتے کرتے میزبانوں کا یہ حال ہوتا تھا کہ نہ رات کو نیند نہ دن کو چین دس دس بارہ بارہ روز کے ملنجھے ہوتے تھے اور

ما سمجھے کیا تھے گویا لڑکی کے لئے ایک قید بے زنجیر لڑکی ایک بے جان چیز سمجھی جاتی تھی اس سے اس کی شادی کے بارے میں مطلق استمزاج نہیں کیا جاتا تھا اس کو شادی سے متعلق کسی بات کے کہنے بلکہ سننے کی بھی اجازت نہ تھی ۔ شکر ہے کہ اب ان باتوں میں بہت کچھ کمی ہوگئی ہے ، شادی کی فضول خرچیاں جن کے قرضے کا بار پشتہا پشت تک چلتا تھا اب بڑی حد تک کم ہوگئیں لیکن ابھی پوری طرح ان کا استیصال نہیں ہوا ہے ۔ جہیز کی زیادتی ابھی اسی طرح تکلیف دہ ہے ۔ میں سمجھتی ہوں کہ حیدرآباد میں جتنا جہیز دیا جاتا ہے اتنا دنیا کے اور کسی حصے میں نہیں دیا جاتا ہوگا ۔ شادی کیا ہے اچھی خاصی خرید و فروخت ہے ۔ لڑکے والوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ جتنا زیادہ ہو سکے جہیز ملے اور لڑکی والوں کی بھی یہی خواہش مہر کے بارے میں ہوتی ہے ۔ امید کہ اس کی بہت اصلاح ہو جائے گی ۔ کیونکہ اب یہ عام طور پر محسوس کیا جانے لگا ہے ۔

دوسرے قسم کے رواجوں اور منتوں مرادوں میں بھی معتدبہ کمی ہوگئی ہے ۔ پہلے بچے کی پیدائش سے لیکر شادی تک بلکہ اس کے بعد بھی ہزاروں تقریبیں ہوتی تھیں مگر اب نئی پود میں یہ شوق بہت کم ہوتا جا رہا ہے ۔

غرضکہ عورتیں اب وہ پہلے کی سی عورتیں نہیں رہیں بلکہ اپنے جائز حقوق حاصل کرنے میں کوشاں ہیں اور یقین ہے کہ ہمارا ملک اب دوگنی رفتار سے ترقی کرے گا ۔

حقیقت حال

زبیدہ ضیاءالدین انصاری

سجدوں پہ سجدے کس لئے بتکدۂ مجاز میں
تیری حکومتیں ہیں جب خانہ کارساز میں

اپنی خودی کو مت مٹا زحمت امتیاز میں
عیش کو اپنے کھو نہ تو فتح طلسم راز میں

دیں گی نہ کامیابیاں درس سکون قلب کچھ
بڑھتی رہے گی آرزو طبع ہوس نواز میں

لیکے پھرا کہاں کہاں جذبۂ اکتساب زر
بس نہ سکے عراق میں رہ نہ سکے حجاز میں

شکوۂ دہر کیوں تجھے مٹ گئیں سب حکایتیں
سوز کا رنگ بھر گیا قلب کے ساز باز میں

تصدیق فاطمہ
علامہ تخلص

دکن کی تعلیم یافتہ خواتین کی موجودہ روش

موجودہ روشِ زمانہ سے کوئی ملک یا قوم ایسی نہیں جو متاثر نہ ہو رہی ہو تعلیم کی روزافزوں ترقی نے سب میں احساس بیداری پیدا کر دیا ہے۔ بنی نوع انسان کوشاں ہیں کہ تہذیب و تمدن، علم و عمل کی منزل ارفع تک رسائی حاصل کر لیں لیکن اس شاہ راہ ترقی پر اقوام مغرب اہل مشرق سے بہت آگے نکل چکی ہیں اور سرعت سے آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ علم و عمل کے اس میدان میں اہل مغرب کا فرقہ ذکور ہی نہیں بلکہ فرقہ اناث بھی ہر قدم پر ساتھ چل رہا ہے۔

خوش قسمتی سے ہمارے ملک کی خواتین بھی اس ہنگامۂ ترقی سے متاثر ہو گئی ہیں اور خواب غفلت سے چونکتی جا رہی ہیں تعلیمی جدوجہد میں وہ نہایت علو ہمتی سے مقابلہ کر رہی ہیں اور اس امر کی بیحد خواہشمند ہیں کہ اپنی مغربی بہنوں سے کسی طرح پیچھے نہ رہ جائیں۔

گو کہ وہ اس کاروان ترقی کی پچھلی قطار میں ہیں لیکن پھر بھی جو کام انھوں نے کئے ہیں وہ نہایت ہمت افزا ہیں چنانچہ مغربی خواتین بھی اب ہندوستانی بہنوں کو محض ایک گھریلو جانور نہیں سمجھتیں اور ان کی علمی سرگرمیوں اور ترقی کو بنظر استحسان دیکھتی ہیں۔ اس امر کا انکشاف لیڈی عبدالقادر کی ۱۹؍ نومبر ۳۸ء کی آل انڈیا ویمن کانفرنس کی صدارتی تقریر سے ہوتا ہے آپ فرماتی ہیں:-

"جن ملکوں میں تعلیم صدیوں سے جاری ہے اور جہاں عورتوں کو آزادی عرصہ دراز سے حاصل ہے وہ بھی یہ دیکھ کر تعجب کرتے ہیں کہ ہندوستانی عورتیں پندرہ بیس سال کے قلیل عرصہ میں ملکی اور قومی تحریکوں کے چلانے میں کس قدر کامیاب ہوئی ہیں۔ اور کس طرح ایک دم ترقی کی موڑ میں مردوں کے برابر بلکہ کئی جگہ ان سے بہتر ثابت ہوئی ہیں"

ہمت افزائی کے ان چند کلمات سے ہمیں ایک گونہ مسرت اور اطمینان ہو جاتا ہے لیکن ہمیں محض اپنی اس

علمی ترقی اور قومی تحریکوں میں شرکت سے مطمئن نہ ہونا چاہئیے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا ہندوستانی عورت تعلیمی جدوجہد میں مصروف رہنے کے باوجود گھریلو زندگی سے بیباک تو نہیں ہوگئی تربیت اطفال اور خانگی ذمہ داریوں کو اسی تندہی سے انجام دے رہی ہے جس طرح آج سے پچاس سال قبل دیتی تھی۔ مغرب کی مادیت نے اس کے مذہبی اعتقاد کو تو متزلزل نہیں کر دیا۔

مذکورہ بالا نکات اگر اس میں موجود ہیں تو ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا ہوگا کہ وہ محض کورانہ تقلید پر اڑی ہوئی ہے اور تہذیب مغرب سے غلط سبق لے کر اپنی مشرقی خصوصیات کو مٹاتی اور مذہب سے بے بہرہ ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ اگر آپ ہماری تعلیم یافتہ بہنوں کا بنظر غائر مشاہدہ کریں تو آپ کو اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ وہ جادۂ اعتدال سے ہٹتی جا رہی ہیں۔

ان کی افراط، تفریط، کورانہ تقلید اور مذہب سے لاپروائی نے نکتہ چینیوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرالی ہے اس بڑھتے ہوئے سیلاب اور موجودہ روش کو دیکھ کر اکثر لوگ تعلیم نسواں سے غلط مفہوم اخذ کرنے لگے ہیں کہ اس کا مقصد تو صرف بیجا نام و نمود، بیباکی، فضول خرچی اور بیجا آزادی ہے، اکثر کی توجہ اس طرف بھی مبذول ہوئی ہے کہ موجودہ نصاب لڑکیوں کے لئے ناقص اور مضر ہے بدیں وجہ بعض گھرانوں میں لڑکیوں کا سکول بھیجنا اور تعلیم حاصل کرنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔

بہنوں کو چاہئیے کہ وہ اپنی آزادی اور تعلیم کو غلط طریقہ سے استعمال نہ کریں کہ لوگ تعلیم نسواں سے مخالف ہو کر ہندوستانی لڑکیوں کی تعلیم میں روڑہ اٹکائیں بلکہ انھیں اپنی تعلیم اور آزادی سے جائز فائدہ لیتے ہوئے ملک اور قوم کے لئے ایسی مثال پیش کرنی چاہئیے کہ لوگوں کی غلط فہمیاں دور ہوں اور وہ لڑکیوں کو تعلیم دلوانے میں کوتاہی نہ کریں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کر کے موجودہ نقائص اور خامیاں دور کرنے کی کوشش کریں۔

انور جہاں قریشی

حیدرآباد کی چند نامور اہل قلم خواتین

یوں تو دکن صدیوں سے علم و ہنر کا مرکز، تہذیب اور تمدن کا مامن اور علم و ادب کا گہوارہ رہا۔ مگر عہد عثمانی میں اُردو زبان و ادب کی جس قدر ترقی اور فراوانی ہوئی ہے اس کی نظیر تاریخ کے دوسرے ادوار میں ملنی ناممکن ہی نہیں محال ہے جامعہ عثمانیہ کے قیام نے "طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" کی آیۃ بینہ کو بدرجۂ احسن تکمیل کو پہنچانے کے وسائل اور اسباب مہیا کر کے دکن کی تاریخ میں ایک نئے اور زرین باب کا اضافہ کر دیا ہے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں اپنے ملک میں انشاء پرداز خواتین کی ایک نمایاں تعداد نظر آتی ہے، جو اپنے نتیجۂ قلم اور افکار عالیہ سے اہل ذوق اور شائقین علم و ادب کو اکثر مستفید فرماتی رہتی ہیں۔ ان میں سے بعض کے ادبی کارناموں کا تذکرہ مختصراً ہدیۂ ناظرین ہے۔

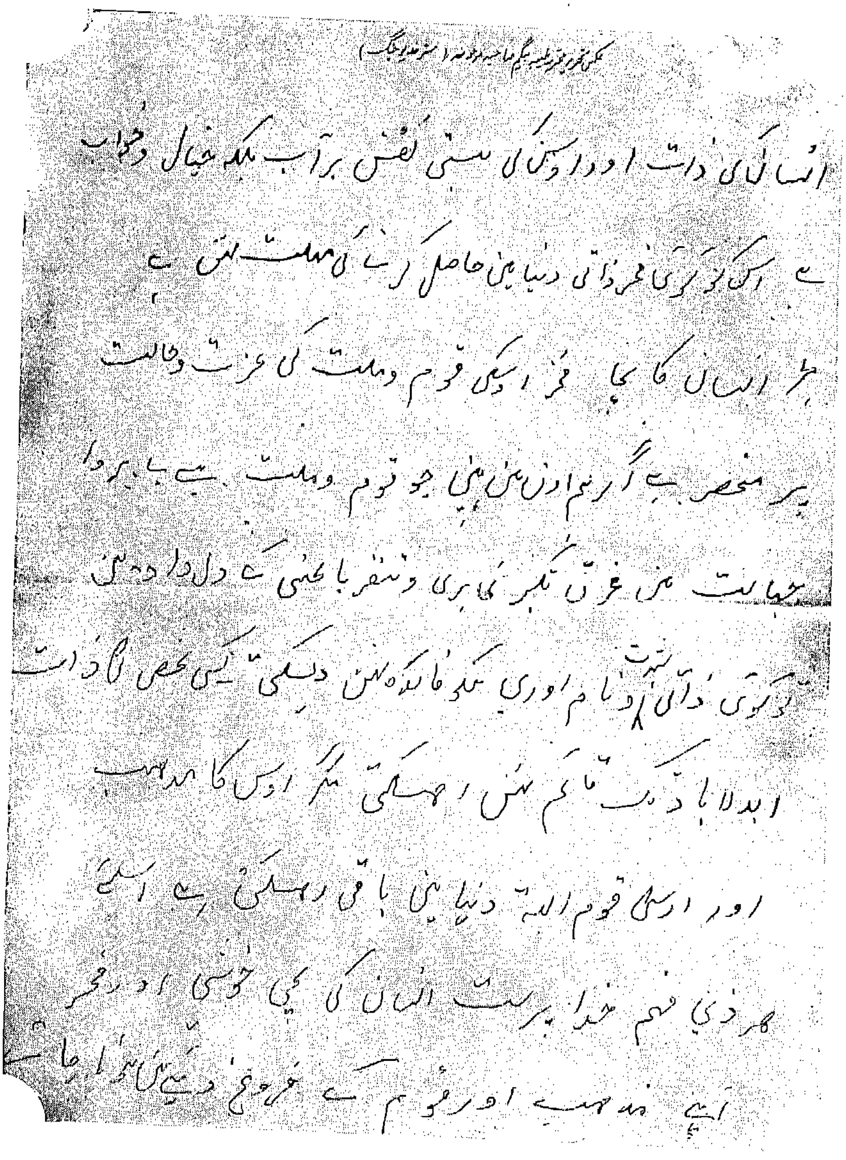
اس سلسلے میں سب سے پہلے ہیں محترمہ طیبہ بیگم مرحومہ مسز خدیو جنگ کا (پاک پروردگار ان پر اپنی رحمت کے پھول برسائے) ذکر کرنا لازمی ہے کیونکہ حیدرآباد میں ترقی و تعلیم نسواں کی اولین علمبردار خاتون ہونے کا شرف آپ ہی کو حاصل ہے۔ آپ ہی نے خواتین دکن میں اپنے مضامین و عالمانہ تقاریر سے بیداری خیالات پیدا کر کے اُن کی جہالت اور جمود کو دور کیا اپنی زندگی کی جدوجہد اور قدر و اہمیت سے آگاہ اور روشناس کرایا۔ اور اس شاہراہ عمل میں گامزن ہونے کی ہدایت و تلقین کی جہاں آج انھوں نے ایک نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل کر لی ہے۔

مرحومہ ایک قابل مصنفہ اور اچھی مضمون نگار تھیں۔ ان کی بہترین تصنیف "انوری بیگم" ایک ناول ہے جس میں انھوں نے اپنے زمانے کی حیدرآبادی معاشرت کا ایک بہترین مرقع پیش کیا ہے۔ ان کا مطمح نظر سوسائٹی کی خامیوں خصوصاً مستورات کے بیجا توہمات، مراسم و قدامت پرستی کو اجاگر کر کے ان کی اصلاح کی طرف توجہ

منعطف کراتا ہے، اور اس میں انھیں خاطر خواہ کامیابی ہوئی ہے۔ جدید تعلیم و تہذیب نے شروع شروع میں نئی پود کو کس طرح متاثر کیا اور قدامت پرستوں نے اُسے کیا سمجھا؟ لائق مصنفہ نے اپنے اس ناول میں اس کا صحیح نقشہ کھینچا ہے اور یہی وجہ ہے کہ افرادِ قصہ پر اکثر ہمیں جیتے جاگتے انسانوں کا دھوکہ ہو جاتا ہے، چونکہ یہ محترمہ کی اوّلین کوشش ہے، اس لئے بعض جگہ اغلاط اور لغزشیں بھی پائی جاتی ہیں مگر محاسن کا پلّہ بھاری ہے خصوصاً زبان بہت ملیّن اور شگفتہ لکھی ہے۔ ایک اور کتاب "حشمت النّساء بیگم" بھی آپ نے تصنیف کی ہے۔ اس کا قصّہ بہت دلچسپ اور بچوں کے مطلب کا ہے۔ کھیل کھیل میں بہت سی کار آمد باتیں اور مفید نصیحتیں لائق مصنفہ نے ایسے پیرایہ میں لکھ دی ہیں کہ خود بخود بچوں کے ذہن نشین ہو جائیں اور ان کے دماغ پر کسی قسم کا بار نہ پڑے۔

ان کتابوں کے علاوہ مرحومہ نے اور بھی بہت سے اصلاحی اور مفید مضامین لکھے ہیں سنا ہے کہ آپ مقررہ بھی بہت اچھی تھیں۔ آپ نے خواتین دکن کی اصلاح اور ترقی کے لئے ایک انجمن بھی بنام "انجمن خواتین اسلام" قایم کی تھی اس انجمن کی اصلی غرض خواتین دکن کی علمی اخلاقی و معاشرتی حالت کا دُرست کرنا، آپس میں میل جول بڑھانا اور غریب و مُفلس لڑکیوں کو ضروری مذہبی تعلیم دینا ہے جو ان کی لائق صاحبزادی کی سرکردگی میں تا حال عورتوں کی فلاح و بہبود کے فرایض انجام دے رہی ہے۔

مسز صغرا ہمایوں مرزا حیا ۔ مسز خدیو جنگ مرحومہ کے بعد خواتین دکن کی اِصلاح و ترقی میں سب سے نمایاں حصہ محترمہ صغرا ہمایوں مرزا کا ہے۔ آپ ایک مشہور مضمون نگار خاتون ہیں اور آپ کی متعدد تصانیف شایع ہو چکی ہیں۔ النساء ایک رسالہ بھی عرصہ تک آپ کی زیرِ ادارت شایع ہوتا رہا۔ آج کل "زیب النساء" ایک اور رسالہ لاہور سے نکل رہا ہے جس کے عملہ ادارت میں آپ بھی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تمام زنانہ رسائل عصمت، تہذیب اور سہیلی وغیرہ میں آپ کے مضامین برابر شایع ہوتے رہتے ہیں، جن کا موضوع اکثر اخلاقی یا سماجی ہوتا ہے۔ کبھی کبھی آپ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ موصوفہ ایک نہایت ہمدرد اور حساس دل رکھتی ہیں، خدمت و اصلاح قوم



عکس تحریر محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ (مسز خدیو جنگ)

انسان کی ذات اور اوس کی ہستی نقش بر آب بلکہ خیال و خواب
ہے اسکو کوئی فخر ذاتی دنیا میں حاصل کرنے کی مہلت نہیں ہے
ہر انسان کا بچا فخر اپنی قوم وملت کی عزت وجلالت
پر منحصر ہے اگر ہم اون میں ہیں جو قوم وملت سے بے پروا
جہالت میں غرق تکبر کی بری و نفرت بخشی کے دلدادہ ہیں
تو کوئی ذاتی شہرت اور نام آوری کچھ فائدہ نہیں دے سکتی کسی شخص کی ذات
ابدالآباد تک قائم نہیں رہ سکتی مگر اوس کا مذہب
اور اوس کی قوم البتہ دنیا میں باقی رہ سکتی ہے اسلئے
ہر ذی فہم خدا پرست انسان کی یہی خوشی اور فخر
اپنے مذہب اور قوم کے عروج و ترقی میں ہونا چاہئے

عکس تحریر محترمہ طیبہ بیگم صاحبہ مرحومہ

ہمیشہ سے آپ کی زندگی کا نصب العین رہا ہے۔ چنانچہ آپ نے غریب و نادار لڑکیوں کو دستکاری و دیگر امور خانہ داری سکھانے کے لئے ایک مدرسہ بھی جاری کر رکھا ہے جو بہت کامیابی سے چل رہا ہے۔ اس کے علاوہ خواتین کی ایک انجمن بھی سماجی و اصلاحی مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ نے قایم کی ہے۔ آپ کی معلومات وسیع اور انداز تحریر سادہ مگر دلنشین ہے۔ شعر و سخن سے بھی آپ کو لگاؤ ہے اور مقررہ بھی اچھی ہیں۔

محترمہ نوشابہ خاتون قریشی بی۔اے ۔ آپ ایک مشہور ادیبہ اور شاعرہ ہیں نہ صرف اردو بلکہ عربی فارسی اور انگریزی میں بھی مہارت تامہ رکھتی ہیں۔ سنہ ۳۲ء تک آپ کلیہ اناث جامعہ عثمانیہ میں تاریخ اسلام اور عربی کی پروفیسر رہیں۔ لیکن پھر مسلسل علالت و ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے آپ ملازمت سے کنارہ کش ہو گئیں۔ اور افسوس یہ ہے کہ تا ہنوز یہ سلسلہ کم و بیش جاری ہے۔ ہر چند بیماری ہارج اور مانع ہے، مگر آپ کے علمی و ادبی ذوق و انہماک کا یہ عالم ہے کہ جب کبھی طبیعت ذرا اصلاح پذیر ہوتی ہے، نظم یا نثر کچھ نہ کچھ ضرور لکھتی رہتی ہیں۔ رسالہ سہیلی لاہور کی آپ اعزازی مدیرہ ہیں اور اکثر اس کے اوراق آپ کے رشحات قلم سے مزین نظر آتے ہیں۔ کبھی کبھی "شہاب" اور دوسرے رسائل میں بھی آپ کی نظمیں شایع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے مضامین خالص ادبی ہوتے ہیں، افسانہ نگاری میں بھی آپ کو اچھا درک حاصل ہے۔ "سہیلی" کے سالنامہ بابتہ جنوری سنہ ۳۳ء میں آپ کا ایک دلچسپ اور طویل افسانہ "حور" شایع ہوا تھا جو فنی خوبیوں کے لحاظ سے بے مثل اور آپ کا شاہکار ہے۔ آپ کی نظموں میں بے حد درد و سوز و گداز پایا جاتا ہے، اور اکثر تصوف کا رنگ جھلکتا ہے۔ حال ہی میں آپ کی نظموں کا ایک مجموعہ "موج تخیل" شایع بھی ہوا ہے۔ کتنا رنج و افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ ایک ایسی لایق، عالم و انشاء پرداز خاتون کو بیماری نے یوں مجبور اور لاچار کر رکھا ہے، بہر حال ہماری دلی دعا ہے کہ خداوند کریم محترمہ موصوفہ کو جلد شفائے کامل عطا فرمائے آمین ثم آمین۔

محترمہ محمدی بیگم صاحبہ بی۔اے ۔ آپ اوائل عمری ہی سے مضمون نگاری میں مہارت رکھتی ہیں۔ تہذیب النسواں اور عصمت وغیرہ میں ایک زمانے تک آپ کے دلچسپ اور مفید مضامین شایع ہوتے رہے ہیں۔ آپ کی تحریریں

روانی اور خیالات میں شگفتگی اور برجستگی غضب کی ہوتی ہے۔ زبان پر انھیں بے حد قدرت اور عبور حاصل ہے، اور اردو ایسی سلیس شستہ اور با محاورہ لکھتی ہیں کہ پڑھ کر جی خوش ہو جائے۔

قیام یورپ کے زمانے میں آپ کے خطوط آپ کی والدہ محترمہ کے نام اکثر 'عصمت' میں شایع ہوتے تھے جو اگرچہ پرائیوٹ ہونے کی وجہ سے بالکل قلم برداشتہ لکھے جاتے ہوں گے مگر آپ کا انداز بیان فطرتاً ہے ہی اس قدر شیریں اور دلچسپ کہ ان میں بھی ایک ادبی شان پائی جاتی تھی۔ زمانۂ طالب علمی میں آپ کالج کی روح رواں رہیں۔ ان کے زمانہ میں کالج سے ایک میگزین نکلتا تھا جس کی ادارت کے فرائض تمام و کمال آپ ہی انجام دیتی تھیں۔ اردو کے علاوہ عربی اور انگریزی میں بھی آپ کامل دستگاہ رکھتی ہیں۔ ایک زمانے تک آپ صغرا ہمایوں مرزا صاحبہ کی انجمن کی سکریٹری بھی رہیں۔ آپ شاعرہ اور مقرّرہ بھی ہیں۔ غرض محترمہ کلیہ اناث کی ایک ایسی مایۂ ناز دختر ہیں جن پر وہ ہمیشہ نازاں و مفتخر رہیگا۔

محترمہ جہاں بانو بیگم نقوی۔ بی۔ اے۔ آپ ایک مشہور انشاء پرداز خاتون ہیں ادب سے فطری ذوق اور دلی لگاؤ رکھتی ہیں۔ آپ کی معلومات وسیع تخیل اعلیٰ اور طرزِ بیان بے حد دلکش اور دلنشیں ہے۔ لکھنے کی قابلیت خدا داد پائی ہے۔ اگر کوئی خیال ذہن میں آجائے تو جب تک اس کو زیب قرطاس نہ کریں انھیں چین نہیں آتا۔ ملک کے مختلف مشہور رسائل اور اخبارات میں ہمیشہ آپ کے مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ ادبی، اخلاقی، اصلاحی، سماجی، مزاحیہ اور طنزیہ ہر قسم کے مختلف اور متضاد موضوعات پر آپ نے طبع آزمائی کی ہے۔ مگر کمال یہ ہے کہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتی ہیں بس یہی معلوم ہوتا ہے گویا "عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی ہیں"۔

انگریزی ادب کی بھی آپ دلدادہ ہیں۔ ٹیگور اور بعض دیگر مصنفین کے عمدہ افسانوں کو آپ نے اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ آپ کے ترجمے بہت کامیاب ہوتے ہیں اور ان میں اصلیت پائی جاتی ہے۔ خوبصورت اور اچھوتی تشبیہیں اور نازک استعارے ان کی تحریر کی جان ہیں، جو عبارت کی دلکشی اور دلاویزی کو چار چاند لگا دیتے ہیں۔ خطوط نویسی میں بھی انھیں ملکہ حاصل ہے، "نگارشِ لطیف" کے بعض اعلیٰ و بہترین نمونے آپ ہی کے رہین قلم ہیں۔

کچھ اصلی نام سے اور کچھ قلمی نام سے ۔ "شہاب بزم خواتین" کی ادارت کے فرایض بھی آپ ہی سر انجام دے رہی ہیں۔
ان کی دنیا تخیلات کی دنیا ہے شعر عموماً نہیں کہتیں ۔ ہاں نثر میں شاعری بلکہ ساحری کرتی ہیں خیالات
میں آمد و روانی اس غضب کی ہے کہ کبھی کبھی تو (پانی کے) دھارے کی طرح بہ کر کہیں سے کہیں جا نکلتے ہیں ۔ اور بات
میں بات پیدا ہوتی چلی جاتی ہے ۔ مضامین کے عنوان اکثر شاعرانہ ہوتے ہیں ۔ اور وہ بھی ایسے کہ بھلائے نہ بھولیں ۔ ان کا
ایک مضمون "وہ گلیاں یاد آتی ہیں کہ بچپن جن میں کھویا ہے" اپنی شاعرانہ کشش اور جاذبیت کی وجہ سے میرے ان سے
غائبانہ تعارف کا باعث ہوا ۔ مگر لطف یہ کہ جب ملاقات ہوئی اور اس کا تذکرہ آیا تو آپ یہ بھی بھول چکی تھیں کہ یہ مضمون
کبھی لکھا تھا ؟ تقریر کرنے سے آپ ہمیشہ گریزاں رہتی ہیں ۔ ان کے مخالف اس پر معترض ہوں تو ہوں مگر جاننے والے
جانتے ہیں کہ ان کا یہ سکوت ہے ۔ "ایسا سکوت جس پہ تقریر بھی فدا ہو" آپ کے مختلف مضامین اور تراجم کا ایک مجموعہ
"رفتار خیال" کے نام سے شایع ہو کر مقبول ہو چکا ہے ۔ "رموز خانہ داری" ان کی ایک اور کتاب ہے ۔ اس کے علاوہ
وہ سب مضامین جو منتشر صورت میں "شہاب" "سب رس" اور "عصمت" وغیرہ کے صفحات کی زینت بنے ہوئے ہیں سنا ہے
عنقریب کتابی صورت میں جلوہ نما ہونے والے ہیں ۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ۔

محترمہ منیر صوفی صاحبہ ایم ۔ اے ۔ آپ بھی ایک قابل اور کہنہ مشق مضمون نگار ہیں ۔ اکثر مضامین مختلف اخبار
و رسائل میں شایع ہوتے رہتے ہیں ۔ دو تین برس ہوئے بغرض سیاحت و علاج آپ یورپ تشریف لے گئی تھیں
وہاں کے مشاہدات "و تعلیمی سفر یورپ کی ڈائری" کے عنوان سے اکثر "سب رس" میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔
آپ کا انداز تحریر بہت سادہ اور سلیس ہے ۔ بیشتر اصلاحی یا اخلاقی مسائل پر مضامین لکھتی ہیں ۔ مقررہ بھی بہت اچھی ہیں

محترمہ لطیف النساء بیگم بی ۔ اے ۔ آپ کا اسم گرامی ناظرین "سب رس" کے لئے محتاج تعارف نہیں ۔ کیونکہ آپ
اس کی ایک مستقل مضمون نگار ہیں ۔ آپ کے دور صحافت کا آغاز حال ہی میں یعنی تقریباً سال ڈیڑھ سال سے ہوا ہے۔
ہمیں علم نہیں مگر بہت ممکن ہے اس سے پہلے بھی آپ کچھ لکھتی رہی ہوں کیونکہ آپ کی تحریر میں بے حد پختگی و متانت اور

ایک عالمانہ شان پائی جاتی ہے جو ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے۔ بہرحال آپ کا پہلا مضمون جو کتابی صورت میں شایع ہوا "ولی کا تخیل" ہے۔ یہ مضمون حد درجہ بلند پایہ اور ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جو تاریخ ادبیات اردو میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس کے بعد آپ نے اقبال علیہ الرحمۃ سے متعلق دو نہایت عالمانہ اور محققانہ مضمون لکھے جن میں سے ایک انعام کا مستحق قرار پایا۔ "شہاب"، "رہبرِ دکن" اور "پیام" وغیرہ میں بھی آپ کے علمی ادبی اور تاریخی مضامین شایع ہوتے رہتے ہیں۔ محترمہ نہ صرف ایک بہترین انشا پرداز ہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کی شاعرہ بھی ہیں۔ "سب رس" میں ننھے بچوں کے لئے جو چھوٹی چھوٹی نظمیں آپ لکھتی ہیں وہ اپنی وضع کی انوکھی اور بالکل نئی چیز ہونے کی وجہ سے لائق ستایش ہیں۔ اس کے علاوہ آپ علمی اور اصلاحی نظمیں بھی لکھتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں بزمِ ادب کی طرف سے ایک نظم پر آپ نے پہلا انعام ایک کپ حاصل کیا تھا۔ خواتین حیدرآباد میں عام طور سے آپ کی تقاریر وجادو بیانی کی ڈھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ جب آپ بولنے پر آتی ہیں تو اپنے عالمانہ خیالات پر جوش و موثر انداز بیان اور مدلل دلائل سے اراکینِ محفل کو ساکت و صامت کر کے ہمہ تن گوش بنا دیتی ہیں۔ غرض آپ ایک ایسی جامع الکمال ہستی ہیں جن پر ملک و قوم جتنا بھی فخر کرے تھوڑا ہے۔

محترمہ رابعہ بیگم صاحبہ۔ یہ بھی ایک اچھی مضمون نگار ہیں مگر لکھتی بہت کم ہیں۔ نثر سے زیادہ ان کی نظمیں دیکھنے میں آتی ہیں جو اخلاقی یا اصلاحی ہوتی ہیں۔ زبان پر اچھی قدرت ہے اور خیالات خواہ نظم میں ہوں یا نثر میں سلجھے ہوئے ہوتے ہیں۔

مذکرہ بالا خواتین کے علاوہ نو مشق مضمون نگاروں میں کلیۂ اناث جامعہ عثمانیہ کی اکثر طالبات مثلاً صفیہ صدیقہ، صفیہ اور رابعہ زین العابدین، شہر بانو نقوی، ممتاز جہاں صوفی، افسر النساء بیگم، ثریا جبیں وغیرہ اسی طرح محبوبیہ اسکول کی طالبات میں انور جہاں قریشی اور دوسری لڑکیاں شامل ہیں۔ جو اچھا خاصہ لکھ لیتی ہیں۔ محترمہ جمیل الرحمن کے مضامین اور بشیر النساء بیگم بشیر کی نظمیں "سب رس" اور "شہاب" میں اکثر شایع ہوتی رہتی ہیں۔ ان سب نے اگر اپنی مشق جاری رکھی تو انشاء اللہ وہ دن دور نہیں جب ان کا شمار بھی ملک کی نامور اہل قلم خواتین میں ہونے لگے گا۔ ہماری دلی دعا ہے کہ خواتین دکن یوں ہی تہذیب و تمدن اور علم و ادب میں دن دونی رات چوگنی ترقی کریں۔ اور آسمانِ شہرت پر درخشاں ستاروں کی طرح جگمگاتی رہیں۔ آمین

تسنیم ربانی

غزل

یہ وہ نظم ہے جو مشاعرۂ بزم ادب میں پڑھی گئی تھی اور جس کے لئے پہلا انعامی کپ دیا گیا تھا۔

عرصہ ہوا ہے درد کو مہماں کئے ہوئے
ہستی کے ساتھ وعدہ و پیماں کئے ہوئے

لیجا رہی ہوں بزم سخن میں جو اشکِ ناز
خونِ جگر میں ہے مرے غلطاں کئے ہوئے

پہنچا نگارخانۂ معنی میں جب خیال
فکرِ سخن میں سر بگریباں کئے ہوئے

دیکھا کہ تھا وہاں نہ تماشائے رنگ و بو
سامانِ صد ہزار گلستاں کئے ہوئے

حیرت میں تھا مذاقِ سخن گو کہ کیا ہوا
اُٹھا ہے کون بزم کو ویراں کئے ہوئے

موجود ہے نہ رنگِ تغزّل نہ کیفِ حُسن
رکھتا ہو جو ہوس کو پریشاں کئے ہوئے

کیا ہو گئے وہ حسن و تعشق کے تذکرے
پروانہ و چراغ کا ساماں کئے ہوئے

نازک خیالیاں وہ ہوئیں کیا جو رکھتی تھیں
بادِ سحر کو مروحہ جنباں کئے ہوئے

کیوں دوڑتا نہیں ہے گل و لالہ پہ خیال
طرفِ چمن کی سیر کا ساماں کئے ہوئے

آشفتگی وہ دشت نوردوں کی کیا ہوئی
دل کو رہینِ چاکِ گریباں کئے ہوئے

آیا جواب دل سے زمانہ بدل گیا ۲
اسلوبِ رنگ نو کو نمایاں کئے ہوئے

ملت کا درد دل میں نہ ہو جن کے بس وہی
بیٹھے ہیں حسن و عشق کا ساماں کئے ہوئے

دنیا عمل سے چلتی ہے بیٹھے ہیں ایک ہم
آزادیٔ خیال کا ساماں کئے ہوئے

طرزِ معاشرت کو بدل کر سمجھتے ہیں
بڑھتے ہیں ہم ترقیٔ نسواں کئے ہوئے

پردہ چھٹا ترقی کی راہیں بھی کھل گئیں
عقدے ہیں زندگی کے سب آساں کئے ہوئے

غافل ہیں وہ مسائلِ تعمیرِ قوم سے
جو رقصِ مغربی کا ہیں ساماں کئے ہوئے

منزل کا ذکر کیا ہے کہ راکب ہے بدرکاب
رہوار بدلگام کو جولاں کئے ہوئے

ہیں آج وہ ذلیل کہ اسلاف جن کے تھے
سب سرکشوں کو تابعِ فرماں کئے ہوئے

ذہنِ درست جوہرِ قابل ہوں جب بہم
آتے ہیں دن ترقی کے ساماں کئے ہوئے

کیا کر رہے ہو بھائیو تقلیدِ غیر میں
رسوائے دہر نامِ مسلماں کئے ہوئے

لطیف النساء بیگم

دکن کے حامیانِ نسواں اصحاب

جس طرح دنیا کی تاریخ لاکھوں پلٹے کھا چکی ہے اسی طرح صنفِ نازک بھی دنیا میں رنگ بدلتی رہی۔ کبھی تو وہ سورج کی طرح درخشاں ہو کر چمکی ہے اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ زمانے نے اس کو ایک عضوِ معطل بنا کر ڈال دیا۔ قبل از اسلام ایک دور عورت پر ایسا بھی گذرا ہے جب کہ اُس کا عدم اور وجود دونوں برابر تھے۔ مگر جب اسلام اپنی نورانی شعاعوں سے عالم کو منور کرتا ہے تو ہمارے پیارے رسول اسلام کی رو سے عورت کو بھی برابر کے حقوق عطا فرماتے ہیں اور تاریخ عورت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ زمانہ بدلتا رہا جب ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا تو مرد بھی بحرِ جاہلیت میں غوطے کھانے لگے۔ ایسے وقت میں غریب عورت کی کس کو پرواہ تھی مگر خدائی کو بھلائی کرنا منظور تھا اس لئے سرسید احمد خان جیسے شخص پیدا ہوئے انھوں نے ہندوستان کے مردوں کو تعلیم یافتہ بنانے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اقسام کی تکلیفیں انھوں نے برداشت کیں مگر جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا اس کو انجام پر پہونچا کر ہی رہے مگر مسلمانوں کا نصف حصہ یعنی عورت ابھی بیکار ہی تھی۔ نہ جانے کیوں سرسید نے اس جانب توجہ نہ کی اس وقت تک اس کا عدم و وجود برابر ہی تھا بہتری کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ عورت تو جب ایک بے حس شئے تھی اور یہ بے حسی اُس وقت تک حرکت میں تبدیل نہ ہو سکتی تھی جب تک کہ اُس کی مُردہ قوتوں کو متحرک نہ کیا جائے اور قوت کو متحرک کرنے والے سوائے مردوں کے اور کون ہو سکتے تھے کیونکہ عورت میں اتنی قوت کہاں تھی جو وہ اپنی بے حسی کو دور کر سکتی۔ بہرحال ہر جگہ کی عورت نے مردوں ہی کے بل بوتے ترقی کی ہے۔ دور کیوں جائیے اپنے ہی ہندوستان کو دیکھئے۔ جہاں ایسے کئی ہمدرد مرد پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے دماغ کی بہترین قوتیں نسوانی سدھار پر صرف کی ہیں مثلاً (۱) شیخ عبداللہ بانی علی گڈھ زنانہ کالج۔ سرسید نے اگر مردوں کی تعلیم کی طرف توجہ کی تو شیخ صاحب کو اُن ہی کے پایہ کا سمجھنا چاہیے کیونکہ آپ نے نسوانی تعلیم کی طرف توجہ کی

علی گڑھ میں زنانہ کالج قایم کیا اور یہ صنف نازک پر ایک احسان عظیم ہے۔ دوسرا اور تیسرا نمبر شمس العلما ممتاز علی مرحوم اور علامہ راشد الخیری مرحوم کا ہے۔ ان دونوں حضرات نے اپنی تمام عمر ہمدردیٔ نسواں میں صرف کر دی اور مرتے دم تک اسی کام میں مصروف رہے۔ ایک طرف تو انھوں نے عورت کو یہ بتایا کہ بہترین طریقہ زندگی گذارنے کا کیا ہے تو دوسری طرف مردوں سے اُن کے حقوق کے لئے لڑے اور اپنی انتھک کوششوں میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے۔ مولانا نذیر احمد مرحوم کو بھی اسی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے یہ تو کل ہندوستان کا کچھ خاکہ ہے لیکن اس مضمون میں دکن کے حامیان نسواں کی مختصر صراحت امید کہ دلچسپی سے دیکھی جائے گی۔

(۱) اس فہرست میں سب سے پہلے مولانا محب حسین مرحوم کا نام درخشاں نظر آتا ہے۔ ان میں خصوصیت اس وجہ سے زیادہ ہو جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی کوششوں کا آغاز اُس وقت کیا جبکہ ترقی نسواں کے سلسلے میں ہندوستان کے کسی حصے سے بھی کوئی صدا بلند نہ ہوئی تھی۔ آپ کی کوششیں زیادہ تر تعلیم نسواں آزادی اور پردے کے خلاف تھیں۔ مولوی صاحب کو اپنے مشن میں پردے کی حد تک ضرور ناکامی ہوئی اور ایسا ہونا لازمی تھا کیونکہ اس وقت وہ تحریک بالکل قبل از وقت تھی مگر تحریک تعلیم نسواں میں بڑی کامیابی ہوئی اور عورتوں میں بیداری پیدا ہونے لگی۔ تقریباً تیس سال تک انھوں نے اپنی جد و جہد جاری رکھی اور ہر ممکن ذریعے سے اپنی مشن کی تبلیغ کی "معلم نسواں" کے نام سے ایک ماہوار رسالہ شایع کرتے تھے۔ دیگر اخباروں اور رسالوں میں مضامین شایع کرتے اور لکچر دیا کرتے۔ اور ان ہی ذریعوں سے انھوں نے اپنا مقصد پورا کیا۔ خواتین کے لئے انھوں نے اُسی زمانے سے علحدہ نصاب تجویز کر دیا تھا جس کے لئے متعدد کتابیں نظم و نثر میں لکھیں وہ شاعر بھی تھے۔ عورتوں کے متعلق سچا درد وہ اپنے دل میں رکھتے تھے اور جو اشعار انھوں نے عورتوں کے متعلق کہے ہیں ان میں حقیقی تڑپ نمایاں ہے۔ چند اشعار نمونتاً درج ذیل ہیں۔

عورتیں کہتی ہیں گھٹ گھٹ کے یہ زندانوں میں ۔۔۔ کیجئے کس سے بیاں حال پریشاں اپنا

درد ہمدردیٔ نسواں کو دکھا ہی دیتے ۔۔۔ ہوتا ممکن کسی پہلو سے دکھانا دل کا

جہالت عورتوں کی زہر ہے اولاد کے حق میں — مگر تاہم اس کو بھی کوئی اچھی دوا سمجھے

آپ نے عقد بیوگان نہ کرنے کے اور تیز بوڑھاپے میں کم عمر لڑکیوں سے شادی کرنے کے متعلق بھی کافی جہاد کیا جس کا پتہ اُن کے اشعار سے چلتا ہے۔

بیوہ کو وصل مرگ کا ارماں نہ ہو تو کیا — دنیا میں کوئی عیش کا ساماں نہ ہو تو کیا
سخت جانی لکھے بیوہ کا کیا حال قلم — اس مصیبت پہ تو پتھر کا کلیجہ بھی ہے شق
بوڑھاپے میں یہ کمسن بیویاں کیا زیب دیتی ہیں — مسلط ایک بوڑھا دیو ہے گویا پرستاں پر

مولوی صاحب کو تصوف سے خاص لگاؤ تھا خطوط محب جو ایک خاتون ہی کے نام لکھے گئے ہیں ان کے خیالات کا آئینہ ہیں۔ اُن کو مشن کے سلسلے میں ہر طرف سے ہدف ملامت بننا پڑا۔ یعنی طعن کی بوچھاڑ ہوئی سخت سے سخت حملے اُن پر کئے گئے مگر یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے کیونکہ تاریخ عالم میں ہر جگہ ایسا ہوتا ہی آیا ہے۔ ان تکلیفوں کے باوجود بھی وہ دھن کے پکے تھے بلکہ اپنی کوششوں میں مصروف رہے اور اسی محنت و کوشش کا طفیل ہے کہ آج عورت کو بھی کچھ سمجھا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ آخر عمر میں صوفی مشرب ہو کر اپنی کوششوں سے خاموش ہو گئے تھے بہر حال مولانا محب حسین مرحوم دکن میں حامیان نسواں کی حیثیت سے علم بردار اور پیش رو ہیں اور انھوں نے ہماری صنف کی بہتری کے لئے جو کچھ کیا ہے وہ قابل تحسین ہے۔

(۲) حامی نسواں کی حیثیت سے دوسری ہستی مرحوم ہمایوں مرزا صاحب بیرسٹر کی ہے۔ جن کا افسوس کہ حال ہی میں انتقال ہوا۔ مرحوم آزادیٔ نسواں کے بڑے حامی تھے ۱۹۰۲ء میں آپ نے ترقی نسواں کے نام سے ایک انجمن قائم کی تھی جو عرصہ تک کامیابی سے کام کرتی رہی۔ انھوں نے اس معاملے میں زبانی کوشش ہی نہ کی بلکہ عملاً بھی اس کا ثبوت دے دیا یعنی عملی کام کے لئے اپنی اہل خانہ صغرا بیگم کو ہر قسم کی آزادی دے رکھی تھی اور نہ صرف یہ بلکہ اُن کی ترغیب اور ہمت افزائی کے لئے ہمیشہ ساعی رہا کرتے تھے اور اسی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے کہ بیگم صاحبہ حیدرآباد کی مشہور اور قابل خاتون سمجھی جاتی ہیں۔

اور ملک و قوم کی حالت سنوارنے کے لئے انھوں نے جو قابل تحسین کام کئے ہیں وہ مرحوم بیرسٹر صاحب ہی کے عملی اقدام کا نتیجہ ہیں۔

(۳) اس فہرست میں ایک اور نام نواب ممتاز یار الدولہ کا بھی پیش کرنا ضروری ہے جو ایسے بزرگوں کی یادگار ہیں۔ صاحب موصوف نے مولوی محب حسین کا اُس وقت ہاتھ بٹایا اور اُن کی آواز پر لبیک کہا جب کہ سب لوگ اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ اور مولوی صاحب کی آواز کا عملی جواب دینے میں پورا پورا حق ادا کیا۔ مولوی محب حسین مرحوم نواب افسر الملک مرحوم کی خاندان کی لڑکیوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اور اس وجہ سے اُن کی تحریک اسی خاندان میں زیادہ بار آور ہوتی تھی۔

نواب صاحب نے ”اصلاح تمدن“ کے نام سے ایک انجمن بھی قایم کی تھی جس میں خواتین حصہ لیتی تھیں رسم و رواج اور طرز معاشرت غرض تمدن کے اکثر امور کی اصلاح کے لئے اس انجمن کے جلسوں میں تقریریں ہوا کرتی تھیں اب بھی نواب صاحب اپنی خاندانی خواتین کی مذہبی اصلاح میں مصروف ہیں چنانچہ ہفتہ وار قرآن اور تفسیر کا درس ہوتا ہے جس میں اُن کے خاندان کی اکثر خواتین شریک ہوتی ہیں۔

بہر حال نواب صاحب نے ہمدردی نسواں کے سلسلہ میں عملی کام میں حصہ لیا ہے۔

(۴) مولوی سید خورشید علی صاحب ناظم دفتر دیوانی و مال کا نام پیش کرنا بھی ضروری ہے جس وقت مولوی محب حسین مرحوم نے آوازۂ ترقی بلند کیا تو صاحب موصوف نے بھی اُن کی جد و جہد میں گرانقدر مدد دی۔ نیز اقبال کلب میں عورتوں کی آزادی اور پردے کے متعلق تقاریر اور مباحثے ہوا کرتے تھے جس کے روح رواں سید خورشید علی صاحب ہی تھے اس کے علاوہ ہندوستان کے اکثر مشہور خصوصاً زنانہ رسالوں میں آپ کے مضامین جو بہبودی نسواں کے متعلق ہوتے ہیں کثرت سے شایع ہوا کرتے ہیں۔ مختصر افسانے لکھنے میں آپ کو خاص مہارت ہے۔

غرضکہ آپ نے ایک سچے رضاکار کی طرح اپنے دماغ کی بہترین قوتیں نسوانی سدھار پر صرف کی ہیں اور آج جبکہ نسوانی بیداری اور ترقی کا ایک مسرت آگیں نظارہ پیش ہے تو یہ اُس کے ایک ابتدائی حقیقی رضاکار کے لئے کتنا کچھ روحانی سرور و مسرت کا سامان ہوگا۔

(۵) احسان فراموشی ہوگی اگر عبدالرزاق صاحب بسمل کا نام نہ لکھا جائے جو دورِ جدید میں عورتوں کے بہترین محسن ہیں۔ رسالہ شہاب جس کے بسمل صاحب ایڈیٹر ہیں اس میں پہلے بھی یہ خصوصیت تھی کہ صنفِ نازک کے مضامین اور کلام بھی کثیر تعداد میں شایع ہوتا رہا ہے لیکن اب بسمل صاحب نے ایک اور جدت یہ کی ہے کہ رسالہ شہاب میں بزم خواتین کے نام سے چند صفحات علیحدہ کر دئیے ہیں جس میں خواتین کا کلام اور مضامین شایع ہوا کرتے ہیں جس کا مقصد یہ ہے کہ عورتوں میں ادب کا شوق زیادہ ہو اور نئی لکھنے والیاں پیدا ہوں۔ بہرحال یہ مقصد بخوبی پورا ہو رہا ہے۔ شہاب کے صفحات پر نئی نئی مضمون نگار خواتین جلوہ افروز ہو رہی ہیں اور خواتین میں ذوقِ ادب ترقی کر رہا ہے۔ غرضکہ بسمل صاحب کا یہ احسان طبقہ نسواں کبھی بھول نہیں سکتا۔ رسالہ شہاب و بزم خواتین کے ساتھ ہی بسمل صاحب اپنے نسوانی کتب کے لئے بھی قابلِ ذکر ہیں۔ "صنفِ نازک" "تذکرۂ جمیل" اپنے وقت کی بہترین کتابیں ہیں جن میں مصنف نے لائق اور قابل عورتوں کو جو گوشہ گمنامی میں پڑی ہوئی تھیں دنیائے ادب کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا اور اس لحاظ سے آپ نے عورتوں کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ بہرحال نسوانی دنیا اور ادبی دنیا دونوں ہی بسمل صاحب کی بڑی حد تک ممنون ہیں۔

(۶) نصیر الدین صاحب ہاشمی کی ہستی دنیائے ادب میں کسی تعارف کی محتاج نہیں لیکن میں یہاں یہ بتانا چاہتی ہوں خواتین کے لئے انھوں نے کیا کیا۔ "خواتین عہدِ عثمانی" ان کی ہی تصنیف اور اپنے فن کی پہلی کتاب ہے جس سے سرزمین دکن کی ان گمنام ہستیوں کو منظرِ عام پر لاکر کھڑا کر دیا کہ اگر ان کا تذکرہ محفوظ نہ کر دیا جاتا تو چند دنوں کے بعد کوئی اُن کا نام بھی نہ جانتا اور دنیائے ادب اُن سے لاعلم رہ جاتی۔ اور اس کتاب سے نہ صرف حیدرآبادی خواتین کی پچیس سالہ ہر قسم کی ترقی کا حال واضح ہوتا ہے بلکہ دوسروں کے دل میں بھی علمی اور ادبی کام کرنے کی خواہش پیدا ہو رہی ہے۔

اس کتاب کے علاوہ ایک اور کتاب بھی ہاشمی صاحب کی تصنیف "خیابانِ نسواں" ہے جس میں صاحب موصوف کے ایسے مضامین درج ہیں جو عورتوں کی علمی ادبی ترقی اور معاشرت کی اصلاح اور رسم و رواج کی ترمیم کے متعلق لکھے گئے اور ملک کے مشہور رسالوں میں شایع ہو کر خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔

ایک اور کتاب زیرِ تصنیف ہے جس میں آپ یہ بتائیں گے کہ "عورتوں نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی"۔

لاسلکی نشرگاہ کے ذریعے بھی آپ نے چند تقاریر کی تھیں جو عورتوں سے متعلق ہیں کلیہ اناث کی بعض طالبات وغیرہ بھی آپ کے علمی اور ادبی معلومات سے استفادہ کیا کرتی ہیں۔ صاحب موصوف ایک اہم فریضہ یعنی اُردو ادب کی تحقیقات کے متعلق انجام دے رہے ہیں اس کے باوجود بھی آپ ہمدردیٔ نسواں کے سلسلے میں سرگرم کار ہیں۔

قبل اس کے کہ ہاشمی صاحب کے متعلق اپنے بیان کو ختم کروں مناسب معلوم ہو رہا ہے کہ محترمہ نقوی صاحبہ بی اے کا ایک جملہ جو انھوں نے ہاشمی صاحب ہی کی کتاب "خیابانِ نسواں" کے "پیش لفظ" میں لکھا ہے اُس کو نقل کر دوں "کسی قوم کی یہ کتنی بڑی خوش نصیبی ہے کہ اُس میں ایسے علم دوست باکمال اور مفکر افراد پیدا ہوتے ہیں جو اپنی محنت کاوش اور دلچسپی کا ثبوت دیکر قوم کے لٹریچر کو فروغ دیتے ہیں۔"

(۷) قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر پیام کا نام بھی قابل تذکرہ ہے آپ نے اپنے اخبار پیام کا ہفتے میں ایک دن خاص عورتوں کے لئے مخصوص کر دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی اخبار پیام کے صفحات ہمیشہ نسوانی ترقی اور اُن کی حمایت کے لئے وقف رہتے ہیں اور یہ نتیجہ ہے قاضی صاحب کی نسوانی ہمدردی کا اور اس دلچسپی کی وجہ اخبار پیام میں جس کثرت سے عورتوں کے مضامین شایع ہوتے ہیں اتنے کسی اور اخبار یا رسالے میں شایع نہیں ہوتے۔ قاضی صاحب کی تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" بھی صنف نازک کی ہی حمایت میں لکھی گئی ہے۔

(۸) مولانا احمد حسین صاحب امجد کا نام بھی اس لحاظ سے قابل تذکرہ ہے کہ اُن کے مضامین خواتین کی مذہبی حالت درست کرنے میں بہت ہی معاون ثابت ہوئے ہیں۔

چند اصحاب جو حامیانِ نسواں ہونے کی حیثیت سے قابل تذکرہ اور صنف نازک کی جانب سے مستحق شکریہ ہیں اُن کے علاوہ اور جو اصحاب خاموشی کے ساتھ اس کام میں ہاتھ بٹا رہے ہیں وہ بھی غائبانہ شکریے کے مستحق ہیں۔ خاص کر ادارۂ ادبیات اُردو کے اربابِ اقتدار جنھوں نے نسواں کے لئے ایک علیحدہ شعبہ قائم کرکے نسوانی کوششوں کو اجتماعی طور پر کامیاب کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ عورت کی ترقی کا ایک سبب مرد بھی ہے، اور قابل تحسین ہے وہ شخص جو عورتوں کے لئے ہمدردانہ جذبات رکھتا ہو اور ایسے حامیانِ نسواں اصحاب خواتین کا دلی شکریہ قبول فرمائیں۔

ذاکرہ بنت فضل اللہ احمد

قطعہ

میری آنکھوں میں جا کرے کوئی
میرے دل میں رہا کرے کوئی

لذتِ قیل و قال کیا کہنا !!!!
میں کہوں اور سنا کرے کوئی

فکرِ دنیائے دوں غمِ عقبیٰ!
رنج کیا کیا سہا کرے کوئی

زندگی خوب ہو اگر تیری
جستجو میں جیا کرے کوئی

ساری دنیا سے گو بگڑ جائے
پر نہ تجھ کو خفا کرے کوئی

تو خبیر و بصیر ہے پھر کیوں؟
لب اظہار وا کرے کوئی

بے طلب دے تو کیا ضرورت ہے
طلب مدعا کرے کوئی

ہو کے خود تجھ سے طالبِ توفیق
کیا بھلا حق ادا کرے کوئی

کس قلم سے رقم ہو تیرا وصف
کس زباں سے ثنا کرے کوئی

رازِ نشائے دوست چپکے سے
مجھ سے کہہ دے خدا کرے کوئی

ہو نہ جس میں بجز فریب کے کچھ
ایسی ہستی کا کیا کرے کوئی

انیسہ ہارون بیگم شروانیہ

عہد عثمانی کی تعمیری ترقیاں

ازمنۂ ماضی کی تاریخ شاہان سلف کے گرانقدر کارناموں اور عظیم الشان یادگاروں کے نقوش کو منصۂ شہود پر مرتسم کئے ہوئے ہے مگر ظاہر ہے کہ عموماً بادشاہوں نے کسی ایک شعبہ، کسی ایک فن کی طرف اپنی توجہ زیادہ مبذول فرمائی کسی کا عہد حکومت فتوحات کے اعتبار سے کسی کا عمارات کے لحاظ سے کسی کا صنعت و حرفت، کسی کا نظم و نسق وغیرہ کی حیثیت سے اہم تر رہا لیکن اعلیٰحضرت حضور لامع النور کا عہد ہمایونی ہمہ حیثیات ممتاز ہے۔ آپ کا وجود مسعود جامع الترقیات اور پیام برکات ہے۔

یہ پچیس چھبیس سال کا عرصہ تاریخی حیثیت سے ایک مختصر سی مدت ہے مگر حیدرآباد کے بارے میں اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اس قدر شاندار کارناموں اور ایسی مابہ الامتیاز ترقیات سے کوئی ربع صدی اتنی منیر نہیں رہی جتنا شاہ دکن کا دور فرمانروائی تجارت و زراعت صنعت و حرفت طبابت و حفظان صحت، پرواز، ریلوے، مالگزاری آثار قدیمہ، تعلیمات و تعمیرات وغیرہ کی ترقیاں عہد عثمانی کی نمایاں خصوصیات ہیں ان میں سے ہر ایک کا بیان بجائے خود ایک ضخیم کتاب کا پیکر حاصل کرسکتا ہے لیکن میرا موضوع اس وقت صرف تعمیری ترقیات ہیں۔

انجینئرنگ ایک ایسا فن ہے جو بلاشبہ کسی ملک کی صحت و تندرستی فلاح و بہبود آرام و آسائش زینت و زیبائش فراغت و مرفہ حالی زرخیزی و سیر حاصلی سے وابستہ ہے اور نظام تمدن میں جس کا نہایت گہرا تعلق ہے۔

حکیم السیاست کی غائر نظر اتنے اہم مقصد سے اغماض نہیں کرسکتی تھی تخت نشینی کے ساتھ ہی حضور پر نور کی توجہ اس شعبہ پر مبذول ہوگئی۔ آپ کے عہد میمنت عہد میں مہتم بالشان بے شمار کارہائے انجینئری سر انجام پائے اور پا رہے ہیں۔ دو قرن پہلے حیدرآباد وغیرہ آباد و سنسان میدانوں ناقابل گذر وحشت ناک جنگلوں سے پٹا پڑا تھا مگر آج

چونے گچ اینٹ پتھر میں سموئے ہوئے جمال و جلال اور تناسب و توازن کا ایک جاذب نظر مرقع عظیم الشان تالابوں بڑے بڑے نالوں ترفیق رساں نہروں مستحکم بندوں مضبوط پلوں مصفا سڑکوں حسن کارانہ پر شکوہ عمارتوں سے آراستہ و پیراستہ دلفریب تصویر ہے جن کی وجہ تعمیر، افادیت، جدت، خوش وضعی اور حسن کاری آپ اپنی نظیر ہے۔

آبپاشی معاشی زندگی میں ایک نہایت اہم چیز ہے ملک کا ویرانہ یا گلزار بنتا، مقامی باشندوں کا خوشحال یا پریشان روزگار ہونا بڑی حد تک اسی پر منحصر ہے۔

بارش خصوصاً حیدرآباد میں ہمیشہ یقینی اور بروقت نہیں ہوتی جس کی وجہ سے ایسے مقامات جہاں آبپاشی کی تنظیم نہ تھی بلائے قحط میں مبتلا ہوتے اور کثیر جان و مال کے نقصان کا سبب تھے اور ایک زرعی نقصان تجارت و فلاحت صنعت و حرفت مالگزاری و آبکاری اور ان کے تحت دوسرے تمام کاروباری محکمہ جات کو شدید متاثر کرتا ہے اور بیروزگاری بیکاری افلاس ملک کی پستی اہل ملک کی تباہی اس کا لازمی ظہور رہا ہے اس لئے کہ ہر شعبہ کی ترقی کا دارومدار زراعت کی کامیابی پر موقوف ہے لہذا بہ حیثیت اجتماعی شعبہ آبپاشی ملک کی معاشی بہبود کے لئے زبردست آلہ کار ہے کسی ملک کے مالیہ کا میزانیہ جو حل مقاصد کی کلید ہے۔ آبپاشی کے ذریعے برقرار ہی نہیں رہتا بلکہ وسعت و استحکام حاصل کرتا ہے اسی مصلحت کے مدنظر سرکار عالی نے آبپاشی کی ترمیم و تجدید تعمیر و توسیع کی طرف بہ طور خاص توجہ منعطف فرمائی اور اس مقصد کے لئے کروڑہا روپیہ صرف کیا گیا اور صرف کیا جا رہا ہے۔

"قدیم و جدید چھوٹے بڑے کئی تالابوں کی ترمیم کی گئی قدیم تالابوں میں رامپا واقع ملگ ضلع ورنگل پاکھال وہرماساگر واقع ضلع ورنگل۔ وغیرہ کا اہمیت اور قدامت کے اعتبار سے حوالہ ضروری ہے۔

جدید تالابوں میں مقامی یعنی واقع حیدرآباد فرخندہ بنیاد عثمان ساگر، (گنڈی پیٹ) اور حمایت ساگر بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۰۸ء کی تباہ کن ہلاکت خیز طغیانی کو صرف تین سال ہوئے تھے اور حیدرآباد اپنی کھوئی ہوئی رونق اور اُجڑی ہوئی آبادی کو عشر عشیر بھی واپس نہ لا سکا تھا کہ شہریارِ دکن جلوہ افروز تخت دکن ہوئے۔ رُود موسیٰ کی

تجربی طغیانیوں کے عملی انسداد کی طرف رائے عالی فوراً منتقل ہوئی نتیجتہً عثمان ساگر کا تعمیری کام آغاز ہوگیا ۔

عثمان ساگر دریائے موسیٰ کو روک کر تعمیر کیا گیا ہے اس کے پانی کی گنجائش (۱۰۷۶۸) مکعب فٹ ہے ۔ اس میں پندرہ دروازے ۴۲×۱۰ فٹ کے نصب ہیں جن سے آب طوفانی بتدریج ندی میں چھوڑا جاتا ہے ۔ ان کے علاوہ ایک چادر بھی اس غرض سے بنائی گئی ہے کہ اگر طوفانی پانی کی مقدار اتنی زیادہ ہوجائے کہ سب دروازے پوری طرح سے کھولنے کے بعد بھی اخراج آب کے واسطے کافی راستہ نہ ملے تو وہ اس چادر پر سے ندی میں بہہ نکلے اس طرح طوفان خیز پانی سے محفوظ رہنے کے یہ دو طریقے پیش نظر رکھے گئے ہیں ۔ چادر کی تعمیر حفظ ماتقدم کے تحت ہے اگرچہ جب سے یہ تالاب تعمیر ہوا ہے چادر پر سے پانی جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی لیکن برسوں میں اس کا احتمال ہو تو یہ چادر نہایت بکار آمد ثابت ہوگی ۔ عثمان ساگر ۱۹۲۰ء میں (۵۸) لاکھ کے صرفہ سے پایۂ تکمیل کو پہنچا ۔ اور حضور پرنور کے اسم گرامی سے موسوم ہوا ۔ یہی وہ پہلا ساگر ہے جس کی تعمیر تجربتہً عمل میں آئی ۔

حمایت ساگر دریائے عیسیٰ کو محدود کرکے بنایا گیا ہے ۔ پانی کی سمائی (۶۶۶۰) ملین مکعب فٹ ہے اس میں سترہ طوفانی دروازے (۱۵×۲۰ فٹ) کے نصب ہیں اور ایک چادر کی دیوار بنائی گئی ہے اس کے بنانے میں وہی اصول ملحوظ رکھے گئے ہیں جو تعمیر عثمان ساگر میں مدنظر تھے ۔ ۱۹۲۷ء میں بہ مصارف (۹۳) لاکھ اس کا کار تعمیری ختم ہوا اور حضرت والاشان ولیعہد بہادر کے اسم سامی سے موسوم ہوا ۔

ان تالابوں کی تعمیر دور عثمانی کے گراں پایہ کارناموں کا ایک اہم عنصر اور عہد خسروی کی یادگار ہائے عظیمہ کا زبردست جز ہے ۔

تعمیری افادیت نے شہر کو رود موسیٰ کے پرخطر حملوں سے ہمیشہ کے لئے مامون و مصئون کردیا ۔ سیلاب بے تہلکہ انگیز سیلابوں کا کلیتہً سد باب ہوگیا باشندگان حیدرآباد کو آبرسانی کی شدید مشکلات سے نجات ملی ، گنگر گہر پلوں کی تنصیب کی وجہ سے عام پبلک تھکے ہوئے مزدور ، پیاسے مسافر ، ٹوٹتے ہوئے راہرو بہ سہولت مسافت اور سختی کی

پانی حاصل کرنے لگے گدلے کنوؤں غلیظ نالیوں کے منبع جراثیم و موجب امراض متعدد و متعدی پانی کے استعمال پر مجبور نہیں رہے ۔

ان دونوں تالابوں کی مدد سے کارہائے ڈرینج جاری ہوسکے جو حیدرآباد کی صفائی اور صحت عامہ رعایا کے ضامن ہیں ضروریات آبرسانی و ڈرینج وغیرہ سے جو پانی بچ جاتا ہے اس سے حمایت ساگر کے نیچے ایک وسیع رقبہ زراعت کے لئے سیراب ہوتا ہے ۔

ماسوا اس کے ان تالابوں کا مقام وقوع حیدرآباد کے گرد و نواح میں ہونے کے باعث شہر کی خوشنمائی دلکشی اور نظر فریبی میں ایک ایسا اضافہ ہوا ہے کہ نہ صرف اہالیان حیدرآباد بلکہ بیرونی سیاح بھی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں ۔

ان تالابوں سے ملحق خوبصورت و خوش وضع چمن بندیاں بھی کی گئی ہیں جو خواص و عوام کے لئے ایک پر فضا اور فرحت بخش تفریح گاہ کا کام دیتی ہیں وزیٹرس کے قیام کے واسطے ان دونوں تالابوں سے متصل نہایت خوش قطع و وسیع بنگلے بنے ہوئے ہیں جو عام پبلک کے لئے مختص کر دئے گئے ہیں ۔

علاوہ ازیں اس اپنی آپ نظیر عہد زرین میں اضلاع میدک، نظام آباد، ورنگل، رائچور، نلگنڈہ، عثمان آباد، بیدر میں بھی رائن پلی سنگم ۔ سنگا بھوپالم ۔ بوئیل مرچیڈ ۔ پالیرو ویرا اینڈی یا کلا ۔ سالکت ٹینک ۔ روئی ٹینک جیسے بڑے تالاب تعمیر ہوئے ہیں جن کے صرفہ کا تخمینہ ایک کروڑ روپیہ اور ان سے پون لاکھ ایکر کا رقبہ سیراب ہوتا ہے ۔

خصوصاً ان اضلاع میں جو قحط سالیوں کا شکار رہتے یہ تالاب نیم جان دیہاتیوں اور پانی کی طلب میں بلبلاتی روحوں کے لئے حیات تازہ کا پیام اور چشمہ زندگی کا کام دیتے ہیں ۔

اس دریائے کرم سے وہ قدیم نہریں بھی فیض یاب ہوئیں جو اپنی قدامت اور اپنی بڑھتی ہوئی وسعت کے لحاظ سے زیادہ توجہ طلب اور محتاج تعمیر ہو گئی تھیں ان میں

(۱) گنگا دُتا پراجکٹ
(۲) محبوب نہر یا پوچارم پراجکٹ } میدک (ایک دلکش نزہت گاہ بھی ہے)

(۳) گرتھور	ورنگل	(۷) گنبھی راؤ پیٹھ	کریم نگر
(۴) آصف نہر	نلگنڈہ	(۸) پاگرا	نظام آباد
(۵) گنگا دھر	کریم نگر	(۹) جوبلی نالا	آصف آباد
(۶) ننھتی	"	(۱۰) پیچل و گنگاوتی کی نہریں	رائچور
(۱۱) توسیعی فتح نہر	میدک	(۱۲) لکشمن چاندا	آصف آباد

کی نشاندہی ضروری ہے لیکن آخرالذکر دو نہریں فتح نہر، لکشمی چاندا پراجکٹس اپنی قدیم و جدید تاریخ کی وجہ سے دوگونہ خصوصیات کی حامل اور خاص طور پر قابل تذکرہ ہیں۔

توسیعی فتح نہر پراجکٹ ضلع میدک کے قریب دریائے مانجرا سے نکالی گئی ہے ۱۳۳۲ف میں تعمیر ہوئی جس کا صرفہ تعمیر ساڑھے پانچ لاکھ ہے (۵۲۰۰) ایکڑ زمین کو سیراب کرتی ہے چونکہ واس نہر جو مذکورہ بالا دریا کے بائیں جانب پر تھی اور حضرت غفران مکان کے نام نامی سے محبوب نہر کے نام سے موسوم تھی اکثر قابل زراعت زمینات کو سیراب نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے توسیع فتح نہر کی ضرورت محسوس کی گئی۔

لکشمی چاندا پراجکٹ دریائے چاندا سے لیا گیا ہے اس سے (۱۶۲۰) ایکڑ زمین کی آبپاشی ہوتی ہے یہ مصارف (۱۹۷۵) ۱۳۴۲ف میں تعمیر ہوا۔ درۂ آبپاشی اور حوض متعلق واقع پٹن اورنگ آباد کی تجدید تعمیر اور توفیر قوت عمل کے تحت ذرائع آبپاشی سے از سر نو اشت خصوصاً میوہ جات کی پیداوار میں روز افزوں ترقی ہے۔

نظام ساگر پراجکٹ حیدرآباد سے (۸۰) میل کے فاصلہ پر واقع ہے عظیم ترین مخزن آب اور نہایت وسیع ذریعہ آبپاشی جس کے پانی کی گنجائش (۳۰۰۰۰) تیس ہزار ملین مربع فٹ اور پھیلاؤ (۵۱ء۶۵) مربع میل ہے جس سے دو لاکھ بہتر ہزار ایکڑ زمین سیراب ہو سکتی ہے جس کی لمبائی سات ہزار فٹ بلندی عمیق ترین بنیاد سے ایک سو اٹھاون اور ندی کی تہہ سے (۱۱۵/۵۰) فٹ کٹے پر سڑک کی چوڑائی ۱۴ فٹ، چادر کا طول تین ہزار ایک سو بیس فٹ ہے۔

اس کے خود بخود اٹھنے والے دروازے جن کا طول و عرض (۴۰ × ۱۵) فٹ ہے اور جن سے تین لاکھ ساٹھ ہزار ملین مکعب فٹ، فی سکنڈ طوفانی پانی خارج ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان طوفانی دروازوں کے اور تو دروازہ عمیق مقام پر مٹی کے صاف کرنے کے واسطے نصب ہیں جن کا طول و عرض (۱۵ × ۸) فٹ ہے۔

دریائے مانجرا کو روک کر بنایا گیا ہے جس کا طول کٹے تک (۳۴۰) میل عرض (۱۹۰۰) فٹ اور جس خطہ سے پانی بہہ کر آتا ہے اس کا رقبہ آٹھ ہزار تین سو چوہتر مربع میل ہے۔ اس کے بائیں جانب جو نہر نکالی گئی ہے وہ ایک سو بیس میل لمبی ہے۔ جس کا طول چھوٹی چھوٹی نہروں کے شمول کے ساتھ تقریباً ایک ہزار میل ہو جاتا ہے اس نہر پر چالیس پل اور بیس اکوڈکٹ (Aqueduct) بنائے گئے ہیں ان نہروں کا گزر دو تالابوں مسانی اور علی ساگر میں سے ہوتا ہے علی ساگر (ضلع نظام آباد) کی ایک دلچسپ سیرگاہ ہے (منسوب بہ علی نواز جنگ بہادر جن کے ہاتھوں بہ زمانہ چیف انجنیری نظام ساگر اسکیم کا نہ صرف اختراع و آغاز تعمیر ہوا بلکہ بہ صرف ساڑھے چار کروڑ روپیہ ۱۳۴۱ف میں پایۂ تکمیل کو پہونچا۔ نظام ساگر کے باعث تعلقات نظام آباد و بودھن، بانسواڑہ، آرمور وغیرہ کی آبپاشی ہوتی ہے "بودھن شکر فیکٹری" اس ساگر کا عطیہ ہے۔ محل وقوع پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے قطرتاً خود نظر فریب ہے۔ دوسرے یہاں ایک خوش منظر چمن "گلگشت" کے نام سے اور ایک خوشنما بنگلہ "دلکشا" کے نام سے بنایا گیا ہے جنھوں نے اس کی دلکشی کو دہ چند کر دیا ہے اور جو باشندگان حیدرآباد اور سیاحان عالم کے واسطے ایک پرفضا تفریح گاہ ہے۔

تعمیر نظام ساگر عہد عثمانی کا ایسا عظیم الشان کارنامہ ہے جو نسلاً بعد نسلٍ باعث فخر و مباہات رہے گا۔

تالابوں پر جو بند تعمیر ہوئے ہیں ان کے طول و ارتفاع اور صرفہ کا حوالہ بھی ضروری ہے تاکہ ان کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

نام	طول	ارتفاع	صرفہ
(۱) عثمان ساگر	۴۴۰۰ فیٹ	۱۱۸ فیٹ	(۵۴۰۰۰۰)
(۲) حمایت ساگر	۷۴۰۰ "	۱۱۱ "	(۹۴۷۲۰۰)
(۳) رائن پلی	۳۴۰۰ "	۵۷ "	(۲۸۵۰۰۰)
(۴) سنگم کنٹہ	(۳۷۷۰) فیٹ	(۴۶) فیٹ	(۴۵۰۰)
(۵) پوٹل مرجیٹر	(۳۶۰۰) "	(۳۶) "	(۲۴۵۰۰۰)
(۶) سنگا کھوپالم	(۴۳۰۰) "	(۴۶) "	(۴۰۰۰۰)

نام	طول	ارتفاع	صرفہ	نام	طول	ارتفاع	صرفہ
(۷) نپڈی پاکلا	(۲۴۰۰) فیٹ	(۵۶) فیٹ	(۶۲۵۰۰۰)	(۱۰) ویرا	(۵۲۲۵) فیٹ	(۸۸) فیٹ	(۳۴۱۶۰۰۰)
(۸) ساکت ٹینک	(۴۳۰۰) ″	(۵۵) ″	(۴۷۰۰۰۰)	(۱۱) پالیر	(۲۳۵۰) ″	(۶۷) ″	(۲۴۵۰۰۰۰)
(۹) محبوب نہر	(۲۳۷۰) ″	(۶۹) ″	(۳۲۰۰۰۰)	(۱۲) نظام ساگر	(۱۰۰۸۰۰) ″	(۱۵۸) ″	(۴۵۰۰۰۰۰۰)

بائیں رُخ کے دو بند (۱۰۴۰) و (۲۰۰۴) فٹ لمبے ہیں بند کی جملہ لمبائی ساڑھے تین میل جو دریائے نیل کے نویں بند کا دو چند ہے اونچائی تہہ کی سطح سے ۱۵۸ فٹ ہے ۔

ان کے علاوہ دس بیس ہزار لاکھ دو لاکھ کے چھوٹے بڑے کئی ایک کام انجام پائے جن کی مجموعی لاگت کا تخمینہ پانچ کروڑ سے کم نہیں اور ہزاروں ایکڑ زمین سیراب ہو رہی ہے ۔ کرشنا و تنگبھدرا کی مزید اسکیمیں بھی زیر غور ہیں جن پر کئی کروڑ کے صرفہ کا اندازہ کیا گیا ہے اور جن سے لاکھوں ایکڑ کاشت کی توقع ہے ۔ تنگبھدرا کی اسکیم کے لئے حال ہی میں کانفرنس مدراس میں منعقد ہوئی اور بہت ہی جد و جہد کے بعد مدراس گورنمنٹ سے اس کا تصفیہ بھی عمل میں آیا توقع ہے کہ عنقریب اس کا کام شروع ہو جائے ۔

تمدن و تہذیب اور ترقی و تنظیم ملک کے لئے وسیع عمدہ اور مصفا سڑکیں بھی ایک جزو اعظم کی حیثیت رکھتی ہیں تجارتی سہولت کاروباری آسانیوں اقتصادی ترقیوں ۔ بیرونی افراد کے ساتھ باہم معاملت کی مشکلات کے حل کا راز انہی میں پنہاں ہے جب تک کہ کسی ملک کے وسائل حمل و نقل اور ذرائع آمد و رفت وسیع اور کافی نہ ہوں صحیح معنوں میں وہ ملک ترقی نہیں کر سکتا قیاس کیا جاتا ہے کہ جاپان کی ترقی کا ایک بڑا سبب اس کی کثیر و وسیع سڑکیں بھی ہیں ۔

بیسویں صدی سے پہلے ریاست حیدرآباد کی سڑکوں کی جو حالت تھی اس کی زیادہ تر توضیح کی ضرورت نہیں سڑکوں کا مجموعی طول صرف ہزار میل تھا اکثر و بیشتر سڑکیں موسم کی تھیں جو تیز رفتار اور وزنی سواریوں کی آمد و رفت کے ناقابل تھیں عہد عثمانی میں شوارع کی ترقی ترقیات کا مخصوص حصہ ہے جن کی وجہ سے کاشت ، تجارت تعلیمی اشاعت ، صنعت و حرفت مراسلت تجارت کاروباری سرگرمیوں ، موٹروں کے بکثرت و بہ عمومیت استعمال اور موٹر بس سروس کے لئے شاہراہیں کھل گئیں

قدیم سڑکوں کی درستی کے ساتھ بلدہ میں جدید مانع غبار سیمنٹ کی سڑکیں تعمیر ہوئیں جن کا طول تخمیناً (۲۷) میل ہے جو ہندوستان کے کسی شہر کو نصیب نہیں۔ اضلاع و تعلقات میں بھی سڑکیں جو نا ہموار نا قابل مرور تھیں گنگ سڑکیں مصفا سہل العبور شوارع میں مبدل ہوگئیں بیدر، محبوب نگر وغیرہ میں ریلوے لائن تیار ہوئیں ریاست کی سڑکوں کے سلسلہ کو برٹش انڈیا کے سلسلہ میں ملایا گیا ہے جس سے عبور مرور و آمد و برآمد مال میں سہولت و وسعت پیدا ہوگئی ہے پایۂ تخت سے چار شاہراہیں شمال میں وسط ہند اور دہلی، جنوب و مشرق میں مدراس اور کلکتہ مغرب میں بمبئی کی طرف بنائی گئی ہیں شمالی ہند کی جانب آمد و رفت کی سہولت کی غرض سے کوہستانی سڑکیں شوارع ایلورا اجنٹا دولت آباد سونتھاڑا وغیرہ تعمیر ہوئیں لوکلفنڈ سے دیہی راستوں کا انتظام کیا جا رہا ہے آج ریاست حیدرآباد کی سڑکیں برٹش انڈیا کی اول درجہ کی سڑکوں کے مماثل مانی جاتی ہیں جن کا مجموعی طول چار پانچ ہزار میل اور صرفہ تعمیر نو کروڑ ہے علاوہ ازیں ممالک محروسہ میں دیہاتوں اور تجارتی منڈیوں تک حمل و نقل کے لئے تقریباً ایک کروڑ کے مصارف سے سڑکوں کی تعمیر کا مسئلہ اور ریلوے لائن کی کئی لاکھ روپے کی توسیع کی اسکیمیں زیر غور ہیں۔

بڑے بڑے مستحکم پل اور کازوے تیار و زیر تیاری حسب ذیل ہیں بڑے طویل دریاؤں پر تعمیر کے باعث رقم کثیر صرف کرنی پڑی۔

دریائے گوداوری پر تین پل اورنگ آباد بہ صرفہ (۷۶۱۰۰۰) ناندیڑ (۹۲۰۰۰) نرمل سون برج (۱۰۵۸۰۰۰) بنائے گئے اس برج کا افتتاح حضرت اقدس و اعلیٰ کے دست مبارک سے ۱۲ مارچ ۱۹۳۵ء میں عمل میں آیا۔

پل دریائے مانجرا پر	سنگا ریڈی	۵۰۰۰۰ کے صرفہ سے	پل رود بھیتورا پر	گلبرگہ	۲۹۸۰۰۰ کے صرفہ سے
” رود کدم پر	نرمل	۲۲۲۰۰۰ ”	” رود کرشنا پر	زیر تعمیر رائچور	۳۰۰۰۰ ”
” رود بھیما پر	گلبرگہ	۹۲۷۰۰۰ ”	” رود کرامات عثمانی مانیر پر	کریم نگر	۳۳۳۰۰۰ ”
” رود موسی پر	نلگنڈہ	۳۲۵۰۰۰ ”	” رود منیر پر	ورنگل	۲۰۰۰۰۰ ”
” رود سندھ پہنا پر	بیڑ	۱۱۶۰۰۰ ”	اور تین کازوئے رود مانجرا پر بہ صرفہ (۵۰۸۰۰)		

بہ مقام لاتور (۷۶۰۰۰) بیدر (۱۳۲۰۰) نظام آباد (۳۰۰۰۰) تعمیر ہوئے جن کے بنانے میں عصرِ جدید کے نوایجاد طریقہ تعمیر یعنی سمنٹ اور لوہے کی بندش سے بھی کام لیا گیا ہے۔ دریائے گوداوری ضلع اورنگ آباد، رود نارنجا ضلع بیدر پر جو پل بنائے گئے ہیں وہ اس جدید طریقہ تعمیر کے ممیز نمونے ہیں۔ حال ہی میں بیگم پیٹھ پر برج لوہے اور سمنٹ سے ۳۰ فٹ چوڑا بصرفہ تقریباً پون لاکھ تعمیر کیا گیا ہے جو اپنی وضع کا ایک ہی پل حیدرآباد میں نظر آئے گا۔ اس کی روشنی، حسن کاری اور رنگ آمیزی کی دلفریبی یورپ کے پلوں کی تصویر کھینچ دیتی ہے۔ حیدرآباد کے صحت عامہ کے لئے کار ہائے ڈرینج پر بھی حضورِ اقدس کی نظرِ رفاہ جو منعطف ہوئی (اس کام کے لئے ایک کروڑ سات لاکھ کی اسکیم تیار ہوئی) عوام کے واسطے متعدد بیت الخلاء تعمیر ہوئے شہر کے روزمرہ مستعملہ پانی اور نجاست کو مختلف موریوں سے روک کر ایک جگہ جمع کرنے اور بعد صفائی زرعی ضرورت کے کام میں لانے کے ذرائع بہم پہنچائے گئے صفائی آب کے لئے عنبرپیٹھ میں حوض تیار ہوئے اور نہر نکالی گئی جس کی وجہ سے کئی ایکر زمین قابل کاشت بنی اور بن سکتی ہے میلوں لمبی زیرِ زمین موریاں فضلے، حوض آب باراں کی بدرویں تعمیر ہوئیں موسمِ بارش کے بہاؤ کے لئے سطحی موریاں بنائی گئیں ڈرینج ورک کی وجہ سے ملک کی پاکیزگی خوشنمائی اور صحت عامہ میں بہت ترقی ہوگئی جو پانی کہ بے قابو ہوکر بہتا تھا اور ملک میں امراض متعدی کے شیوع کا باعث تھا۔ وہ ایک مفید و کارآمد شئے میں تبدیل کر دیا گیا۔

آبرسانی کا انتظام معمولی طریقہ پر صرف دو اضلاع نظام آباد و اورنگ آباد میں تھا جس کی اب تین لاکھ پچاسی ہزار کے صرفہ سے نہایت وسیع پیمانہ پر توسیع کی گئی ہے گلبرگہ، رائچور، جالنہ، پربھنی، لاتور، محبوب نگر، ناندیڑ، مانوی ورنگل اور عثمان آباد میں جدید طریقہ پر پچپن لاکھ اکتیس ہزار کے صرفہ سے فراہمی آب کا بندوبست کیا گیا ہے۔ گلبرگہ، رائچور کے مواضعات میں تین سو باؤلیاں کھدوائی جاچکی ہیں نیز پربھنی آصف آباد، بیڑ، مومن آباد، بودھن، کھمم تلجاپور، میدک کی اسکیمیں زیرِ غور ہیں۔

شاندار بکارآمد خوشنما عمارات جن میں اکثر رفاہِ عام سے متعلق ہیں تعمیر ہوئیں۔

عثمانیہ عدالت العالیہ واقع بلدہ کنارہ رودِ موسیٰ نمایاں سنگ بستہ ہے ہندوستان کی عمارتوں میں بوجہ گرانائٹ پتھر کی تعمیر کے بہت خوش منظر اور پائیدار سمجھی جاتی ہے اکیس لاکھ اکیس ہزار کے صرفہ سے تعمیر ہوئی اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جس مقام پر یہ واقع ہے وہاں شاہان قطب شاہیہ کا داد محل تھا۔

دواخانہ عثمانیہ واقع افضل گنج کنار رودِ موسیٰ صرفہ تعمیر چوبیس لاکھ (صرفہ کے لحاظ سے ہندوستان میں دوسرے نمبر پر ہے) اس سے سیکڑوں مریض آرام اٹھا رہے ہیں۔

سٹی کالج۔ واقع کنار رودِ موسیٰ شاندار عمارت ہے نو لاکھ چوبیس ہزار کے صرفہ سے تعمیر ہوئی اس وسیع عمارت میں تیرہ سو سے زیادہ طلبہ تعلیم پا رہے ہیں۔

عثمانیہ یونانی شفاخانہ۔ قریب چار مینار طرز تعمیر و خوش وضعی کے اعتبار سے ممتاز سمجھی جاتی ہے صرفہ تعمیری پانچ لاکھ بتیس ہزار ہے علاج و معالجہ کے ساتھ ساتھ اس میں قدیم علم طب کی تعلیم و تدریس کا بھی انتظام ہے

مرض دق کے دواخانہ واقع دبیر پورہ و لنگم پلی ایک لاکھ کے زائد صرفہ سے تعمیر ہو چکے ہیں اور وقار آباد میں بہت بڑا دق کا سینیٹوریم بصرفہ دس لاکھ تیار کئے جانے کی اسکیم مکمل ہو چکی ہے اور اس کے لئے زمین بھی حاصل کی جا چکی ہے۔

کتب خانہ آصفیہ۔ کنار رودِ موسیٰ دو لاکھ پچاس ہزار روپیہ کے صرفہ سے تعمیر ہوا ہے خوش وضع عمارت ہے روزانہ کثیر التعداد شائقان مطالعہ اس سے فیض حاصل کر رہے ہیں۔

نمائش گاہ باغ عامہ ایک لاکھ ستر ہزار کے صرفہ سے تعمیر ہوئی۔ ملکی مصنوعات و آثار قدیمہ کا عجائب خانہ ہزاروں لوگ اضافہ معلومات کا استفادہ کر رہے ہیں۔

جوبلی ہال۔ [illegible] باغ عامہ حضور اقدس کے جشن سیمیں کی یادگار بلحاظ طرز تعمیر بہترین عمارت ہے اس کی شہ نشین اٹلی کے بیش قیمت پتھروں سے تیار کی گئی ہے ساڑھے تین لاکھ کے صرفہ سے تعمیر ہوئی۔

جوبلی پویلین ۔ جدید خطوط پر تقریباً ڈیڑھ لاکھ کی لاگت سے تعمیر ہوا ہے روشنی اور ہوا کا انتظام بالکل طرز نو پر ہے سارا سینک نقش و نگار سے آراستہ کیا گیا ہے اس میں اجنٹہ کی حسن کاری کے مناظر پیش کئے گئے ہیں الحمرا کی چند خصوصیات کو مغلیہ طرز کے نقش و نگار کے ساتھ نمایاں کیا ہے ۔

قصر شاہی ۔ واقع دہلی نہایت خوش نما اور دلکشا قصر ہے جس کی تعمیر پر تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا۔

جامعہ عثمانیہ ۔ (واقع اڈک میٹہ) ہندوستان کی جامعات میں ایسی عظیم الشان جامعہ کا کہیں جواب نہیں اس کی وجہ سے نظام تعلیم میں جو لطیف و خوشگوار انقلاب رونما ہوا ہے اس نے علمی و تمدنی فضا میں خود اعتباری و کارکردگی کی ایک لہر دوڑا دی ہے ۔

یونیورسٹی کا آرٹ کالج (کلیہ فنون) اس جامعہ کا سب سے بڑا کالج ہے ۔ حیدرآباد کی تاریخ میں اپنی نوعیت کی ایک بے نظیر بلڈنگ ہے یہ پوری عمارت سنگ بستہ ہے ۱۳۴۳ف میں شاہ دیجاہ نے اپنے دست مبارک سے اس کا سنگ بنیاد رکھا اس کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زیریں منزل ہندو صنعت یعنی ایلورا کی وضع اور بالائی منزل اسلامی حسن کاری یعنے خوشنما مسلم طرز تعمیر کی گئی ہے جس میں دو ہزار طلبہ کی گنجائش رکھی گئی ہے یہ کالج تیس لاکھ کی لاگت سے تعمیر ہو رہا ہے حیدرآباد کی سب سے بڑی بلڈنگ یہی ہے اس کا طول (۳۵۰) فٹ عرض (۳۲۰) اور سب سے اونچے حصے کا ارتفاع ستر فٹ ہے بالائی حصہ کی چھت پر ایک گنبد بھی سمنٹ اور لوہے سے ۵۴ فٹ مربع انٹرنس ہال کے ستونوں پر قائم کیا گیا ہے جو حیدرآباد میں نئے قسم کا سب سے بڑا گنبد ہے اس بلڈنگ کی تعمیر میں نہ صرف ہندو مسلم حسن کارانہ اشتراک و اتحاد کو ملحوظ رکھا گیا ہے بلکہ اس سے تاریخ دکن کا باہمی اظہار ہوتا ہے علاوہ اس کے دو اقامت خانے دو منزلہ تین سو لڑکوں کے واسطے اسلامی حسن کاری پر تعمیر کئے گئے ہیں جس میں صفائی اور حفظان صحت کے اصول کے مدنظر بیت الخلاء حمام وغیرہ بنائے گئے ہیں اور طلبہ کی سہولت کے واسطے مطالعہ کے کمرے بھی رکھے گئے ہیں ۔ نیز دو ڈائننگ روم علحدہ علحدہ تیار کئے گئے ہیں جن میں ایک ان طلبہ کے

واسطے ہے جو گورنمنٹ کا استعمال نہیں کرتے بارہ میل کی سڑکیں بھی تعمیر ہو چکی ہیں جن کے دو رویہ نہایت خوشنما درخت لگاکر
ان کو دلکش بنایا گیا ہے اور ایک خوش قطع مکان پہاڑی پر پروائس چانسلر کی رہائش کے لئے بنایا گیا ہے۔
یونیورسٹی کی اسکیم ڈھائی کروڑ کے اندازے کی ہے جس میں دس کالج ایک دواخانہ، مارکٹ، اسٹیڈیم
کلب، طلبہ کا یونین، باغ، پروفیسروں کے مکانات، ڈپہ خانہ، تار آفس اور ایک تالاب جس میں تیراکی کی تعلیم
اور کھیل ہوں گے۔ خواتین کے لئے کلیہ جات اور اقامت خانہ جات علحدہ تعمیر ہوں گے۔ غرض کہ یہ خاص یونیورسٹی
ٹون کیمبرج، آکسفورڈ کے اصول پر تیار کیا جا رہا ہے جس میں تقریباً ڈھائی ہزار طلبہ تعلیم پاسکیں گے۔ جامعہ عثمانیہ
عہد زرین عثمانیہ کا وہ درخشاں اور مایۂ ناز کارنامہ ہے جو نہ صرف موجودہ بلکہ آنیوالی نسلوں کو فلک افتخار پر چمکاتے رہے گا
یہ وہ شاہکار ہے جس کو اہل دکن قدر دانی و سپاسگزاری کی نظروں سے ہمیشہ دیکھتے رہیں گے اور وہ گراں پایہ
یادگار ہے جو اہل ملک ہی سے نہیں بلکہ دنیا کے ارباب فن صاحب نظر افراد سے خراج تحسین حاصل کرتی رہیگی۔
ان کے سوا جاگیردار کالج۔ ٹون ہال۔ مسجد شاہی، باغ عامہ، اسٹیشن نامپلی، اسٹیشن کاچیگوڑہ
وکٹوریہ زنانہ ہاسپٹل۔ محبوبیہ گرلز اسکول، سرائے نامپلی، عثمانیہ جوبلی پارک، مزرعہ حمایت ساگر، ڈائری فارم
حمایت ساگر، پولس و فوج کوارٹرس، دار التجربہ، نظام کالج، چوکھنڈی واقع مکہ مسجد، مومن آباد، کنٹونمنٹ اور
دفاتر سرکاری کے عمارات عہدہ داران سرکاری کے رہائشی امکنہ، مسافر بنگلہ، رسٹ ہوس، بچوں کے کھیلنے کے لئے
پارک وغیرہ کثیر التعداد عمارات تعمیر ہوئیں جن کا مجموعی صرفہ سات کروڑ سے زیادہ ہے۔
آرایش بلدہ کے سلسلہ میں ملک پیٹھ۔ ملے پلی، نامپلی، چنچل گوڑہ وغیرہ میں غرباء کے لئے ڈھائی ہزار
کی تعداد میں پختہ آرام دہ مکانات بنائے گئے بجائے کویلو کے تنگ و تاریک کھنڈلوں اور گھاس پھوس کے گندے
چھپروں کے جن میں نہ بارش سے بچاؤ تھا اور نہ دھوپ و سردی سے حفاظت نہ کیچڑ اور موریوں کی نجاست سے نجات
اور جو امراض وبائی کے آماجگاہ بنے ہوئے تھے ان غریبوں کو ایسے مکانات میسر آئے جو ان کے لئے ایوانات سے

کم آرام دہ نہیں دس ہزار نفوس جن سے فیض پا رہے ہیں اور طاعون و دیگر امراض متعدی سے محفوظ ہو گئے ہیں
اس کے علاوہ مانع گرد وسیع و خوشنما سڑکیں اور خوش وضع دکانیں اندرون شہر تیار کی گئیں جس نے شہر
کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دئے ان سب کاموں پر تخمیناً ۲۲ کروڑ روپیہ صرف ہوا ہے کارہائے تعمیر میں صرف تعمیر ہی
مدنظر نہیں رہی بلکہ ایجادات و اختراعات سادگی اور شان و شوکت ہندو مسلم صناعی اور حسن کاری کے بھی بہترین
نمونے پیش کئے گئے ہیں۔

یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہ ہوگا کہ شعبہ تعمیرات پر توجہ فرما کر ذات ہمایونی نے نہ صرف عمارات اور اس کے متعلقات
کو منظم فرمایا بلکہ تعمیر انسانی کا راز بھی اس میں مضمر ہے۔

اہل ملک کا تیفنا، انجینیرنگ کے ارتقاء کے ساتھ ایک گہرا تعلق رکھتا ہے۔ قوم کا ایک تندرست تازہ
توانا فرد دس مریض افراد پر بھاری ہے تعمیراتی اصلاح سے قبل محلوں کی گنجانی سڑکوں کی تنگی وغبار آلودگی گلیوں کی کثرت
بدرروں کی گندگی زہریلے اثرات قوائے جسمانی اور صحت بدنی کو نامعلوم طریق سے مسموم و تحلیل کر رہے تھے اب اس کے
برخلاف حفظان صحت کی قوی امید ہو سکتی ہے اور ملک زیادہ صحتور افراد پیدا کر رہا ہے۔

محکمہ تعمیرات کے قیام اور تسلسل کار سے لاکھوں کی تعداد میں افراد کے لئے روزگار کے وسائل میسر آئے
بیکار لوگ برسرکار ہو گئے جس نے معاشی کش مکش میں بہت کچھ کمی پیدا کر دی۔

تعمیراتی ترقی یعنی آبپاشی سڑکوں اور ریلوں کی تیاری کی وجہ سے ملک میں دولت و خوش حالی کا اضافہ ہوا
مالگزاری بڑھ گئی آمدنی کی توفیر سے حکومت ہر محکمہ خصوصاً تعلیمات پر بے جگری و فیاضی سے روپیہ صرف کر سکتی ہے۔

صنعتی زرعی تجارتی تعلیمی نیم جان جسموں میں تعمیری ارتقائے نئی زندگی کی لہریں پیدا کر دیں۔

شوارع کے سہل العبور مانع گرد اور وسیع ہونیکی وجہ سے آمد و رفت اور نقل و حمل میں جو سہولتیں پیدا ہوئیں
پانی کے محفوظ کرنے اور بوقت ضرورت اس کے استعمال سے کاشت کی وقتیہ ضرورتوں کے پورا کرنے میں جو آسانیاں

میسر آئیں انہوں نے علم و عمل کی سرگرمی اور چہل پہل کو المضاعف کر دیا تاجر و صنّاع بسرعت اپنے مال کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل و بیع اور طالب علم بسہولت اپنی درسگاہوں میں عبور و مرور کر سکتے ہیں۔

عثمانیہ یونیورسٹی سیکڑوں قابل کارکن قوم پرست، فارغ التحصیل افراد پیش کر رہی ہے بنا بریں اس شعبہ کی تعمیر ملک و اہل ملک کی قطعی تعمیر ہے۔

والی دکن کو شاہ جہاں ثانی کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں آپ کو شاہ جہاں پر بھی ترجیح حاصل ہے کیونکہ شاہ جہاں کا نقطۂ نظر تعمیر سے زیادہ تر ملکی خوشنمائی یا جذبۂ قلبی (جس کا نتیجہ روضۂ تاج محل ہے) تھا مگر شہریار دکن کے تمام کام رفاہ خلق سے جس کا احساس ہمیشہ قلب شاہانہ کے قریں تر رہا ہے تعلق رکھتے ہیں۔

اے قبائے بادشاہی راست بر بالائے تو　　زینت تاج و نگیں از گوہر والائے تو

رابعہ بیگم (انوار اللہ)

تجلیات

کلی چٹکی، چمن پھولا، نسیم مشک بار آئی
دکن میں "جوبلی" کیا آئی اک فصل بہار آئی

پھلا پھولا رہے گلزار شاہی باغ عالم میں
یہ سوئے حیدر آباد دکن بانگ ہزار آئی

حکومت ہے شہا تیری قلوب اہل عالم پر　　عجب شاہی ترے حصے میں شاہ تاجدار آئی

شہر بانو بیگم نسرین

نوائے دل

ارض و سما ہے ادنیٰ کرشمہ کریم کا　　کون و مکاں ہے جلوہ محمدؐ کے میم کا
چاکِ سحر ہے مطلعِ سوزِ درونِ غم　　خونیں نوا شفق میرے دردِ قدیم کا
ہر ذرّہ ہے لئے ہوئے صد جلوہ روبرو　　اصرار پھر عبث ہے ہمارے کلیم کا
تنکے جمع کئے بھی نہ تھے آشیاں کے ہم　　بجلی نے خاتمہ کیا عزمِ صمیم کا
بنتِ عنب ہے تاک میں گمراہیاں لئے　　زاہد بچھائے دام رہِ مستقیم کا

یک محشرِ خیال ہے دنیا کہیں جسے
کھٹکا لگا ہے زیست میں امید و بیم کا

جہاں بانو بیگم

بتقریب جلسہ وداعی محترمہ بشیر النساء بیگم صاحبہ بی، اے

بوقت روانگی بجانب مصر

عجب منظر یہاں پیشِ نظر ہے — خوشی کے ساتھ غم کا بھی گذر ہے
پڑھی ہے نصِ قل سیروا فی الارض — یہاں تفسیر اسی کی جلوہ گر ہے
توازن حال و مستقبل کا کیجیے — یہ دھندلا اور وہ تابندہ تر ہے
ملی یعقوب کو جس سے بصارت — دیارِ مصر وہ گنجِ بصر ہے
وہ رودِ نیل وہ رنگیں فضائیں — جہاں ہر سمت فردوسِ نظر ہے
اسی رنگین وادی میں پلے تھے — وہ یوسف، جن کا شہرہ دربدر ہے
فضا ہنگامہ پرور ہے وہاں کی — وہاں علم و ہنر اب زور پر ہے
وہی ہے جامعہ ازہر کا مسکن — علومِ مشرقی کا اب جو گھر ہے
مبارک ایسی منزل تک رسائی — جہاں تہذیب ہے علم و ہنر ہے
جدائی آپ کی تکلیف دہ ہے — مگر دل طائرِ بے بال و پر ہے

کریں کیوں ہم نہ یہ فرقت گوارا
جو ہونے کو ہے سونے پر سہاگا

اقبال النساء بیگم

حدیثِ نسواں

یعنے

دورِ عثمانی میں خواتینِ دکن کی ہر جہتی ترقی کی اجمالی روئداد

یہ شہ کا عہدِ زریں عجب خوشگوار ہے — ہر دل عزیز شہ پہ رعایا نثار ہے
ممنون ہر بشر ترا، اے تاجدار ہے — یہ طبقۂ اناث بھی منت گذار ہے

ہم پر ہوئی ہے خاص توجہ حضور کی
سرکار نے ہماری فلاکت ہے دور کی

علم و خرد سے عاری ہمارا کلام تھا — تعلیم کا خیال، نہ کچھ انتظام تھا
محکوم سب کے ہم تھے، یہی اپنا کام تھا — "ناقصاتِ عقل" ہمارا ہی نام تھا

ہم سب کے سر کے بوجھ تھے دنیا پہ بار تھے
خود اپنی ہی نظر میں ذلیل اور خوار تھے

کیا کیجئے بیاں کہ عجب حالِ زار تھا — رحم و کرم پہ اوروں کے بس انحصار تھا
جہاں آنا جانا بھی تک ناگوار تھا — مرضی کوئی ہماری، نہ کچھ اختیار تھا

تھا کس کا دل جو سیر و سیاحت کا نام لے
کس کی مجال تھی جو ولایت کا نام لے

یہ ملک سہ تھا، زمیں بھی یہی تھی یہی فضا — دلچسپیوں کے سیر کے ساماں تھے جابجا

اسکول بھی، دفاتر و گلشن بھی جانفزا — پر کچھ نہ تھا ہمارے لئے قید کے سوا

"لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے"

پچیس سال پہلے ہمارا یہ حال تھا — استانیوں کا ملک میں گویا کہ کال تھا
صحت کا اور فلاح کا کس کو خیال تھا — جینے پہ اپنے آپ ہی ہم کو ملال تھا

لیکن خدا کا شکر ہے حالت بدل گئی
برسوں کی جو بلا تھی، وہ اک دم میں ٹل گئی

تختِ دکن پہ شاہ جو نہی جلوہ گر ہوئے — تنظیم و انتظام کے احکام سر ہوئے
اگلے جو نظریئے تھے وہ زیر و زبر ہوئے — نازل کیوض طبقۂ مظلوم پر ہوئے

قائم کئے مدارسِ نسواں نئے نئے
پیدا ہوئے فلاح کے ساماں نئے نئے

حاصل ہوئیں ہمیں شہ عثماں کی برکتیں — ہونے لگیں پھر اس تن بیجاں میں حرکتیں
اس دستِ فیض کی ہیں یہ ساری کرامتیں — جس کے کرم نے کی ہیں مہیا سہولتیں

اس شاہ ذی حشم کی توجہ نے خاص کر
احساں کئے ہیں طبقۂ نسواں کے حال پر

اس کے کرم سے قابل و خوددار ہم بھی ہیں — ہر شعبۂ حیات میں ہم کار ہم بھی ہیں
اعلیٰ ترقیوں کے طلبگار ہم بھی ہیں — یہ دن بھی آیا، کہتے ہیں سرکار ہم بھی ہیں"



سانولی شہزادی   اجنتا کے پہلے غار میں

اس عہد کامگار میں حالت سنبھل گئی
فی الواقعی ہماری تو دنیا بدل گئی

علم و ادب سے آج ہر اک گھر ہے بوستاں
فنی، تمدنی، ہوئیں حاصل ترقیاں
یہ اک کرشمۂ شہ عثماں ہے اب یہاں
لڑکوں کی طرح پاتی ہیں اسناد لڑکیاں

بنیاد عہد شہ میں ہوئی گرل گائیڈ کی
اس دور میں زنانہ کلب کی بنا ہوئی

قائم ہوئی ہیں انجمنیں اور بھی یہاں
جلسے کہیں ہیں اور کہیں بزم سخنوراں
محروم علم اب نہ تو لڑکے نہ لڑکیاں
گھر گھر سے اب ترقی تعلیم ہے عیاں

ممنون و مطمئن نظر آتے ہیں آج ہم
سرکار کے طفیل سے کرتے ہیں راج ہم

لاشے سہی، مگر جرس کارواں ہوں میں
اک طبقۂ نحیف کی گویا زباں ہوں میں
شکر و سپاس و عجز کی اک داستاں ہوں میں
منت گزار بارگہ خسرو نشاں ہوں میں

یا رب اثر سے عرض کا مقصد حصول ہو
یہ التجا بشیر کی یا رب قبول ہو

جب تک سحاب چرخ سے بارش ہوا کرے
جب تک کہ ماہ و مہر میں گردش ہوا کرے
جب تک ہوا سے ہر متنفس جیا کرے
اس وقت تک رہے یہ حکومت خدا کرے

جاوید ہندوستاں میں عثماں کا نام ہو
دل فتحمندیوں سے سدا شاد کام ہو

بشیر النساء بیگم بشیر

ادارۂ ادبیات اردو

کی

کتاب نذر ولی

کے متعلق ہندوستان کے بہترین علماء و فضلا کی رائیں

مولانا سید سلیمان ندوی رسالہ معارف اعظم گڈھ بابت نومبر ۱۹۳۸ء

ولی دکنی کے دوصد سالہ جشن میں حیدرآباد کی تعلیم یافتہ خواتین بھی وہاں کے صاحب قلم مردوں سے پیچھے نہیں رہیں، بلکہ "ولی" کی درگاہ میں ان کی نذر مردوں کی نذر سے بڑھ گئی، ولی کی یادگار کے سلسلہ کے بیشتر مضامین نظر سے گذرے، مجموعی حیثیت سے نذر کے مضامین ان سب میں گراں پایہ ہیں اس مجموعہ میں ولی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر جامعہ عثمانیہ کی ام اے کی چار طالبات کے مبسوط و محققانہ مضامین ہیں، "ولی کا تخیل" لطیف النساء بیگم "کلام ولی اور تصوف" نجم النساء بیگم "ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری" نسیم النساء بیگم "ولی کا فن شاعری" جہاں بانو بیگم، یہ چاروں مضامین جامعہ عثمانیہ کی طالبات کے ادبی ذوق اور علمی استعداد کا بہترین نمونہ ہیں، ہم نے سب مضامین بالاستیعاب دیکھے، بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وسعت نظر اور ژرف نگاہی کے ساتھ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے، ہر مضمون اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت جامع اور مکمل ہے خصوصاً "ولی کا تخیل" نہایت جامع اور مبسوط ہے، تنہا یہی مضمون ولی کی پوری شاعری پر تبصرہ کے لئے کافی تھا، دوسرا مضمون اور حیثیتوں سے بہتر ہے، بلکہ صوفیانہ مصطلحات اور رموز و نکات کے لحاظ سے رابعہ بصری کا رسالہ معلوم ہوتا ہے لیکن ہر شعر کو تصوف کے معنی پہنانے میں نہ کامیابی ہوئی ہے اور نہ اس کی ضرورت تھی، تیسرے مضمون میں ولی کی معلومات کا دقت نظر سے التفات کیا گیا ہے، چوتھا مضمون فنی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے بہتر ہے، خصوصاً ادبی حیثیت سے بہت خوب ہے، غرض یہ گلدستۂ رنگ و بو ہر لحاظ سے ایوان ادب کی زینت بننے کے لائق ہے، یہ چاروں مضامین

اس پا چکے ہیں کہ اگر وہ معزز خواتین کے ناموں سے منسوب نہ ہوتے تو یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ نو آموز طالبات کے ہیں یا کسی پختہ کار اہل قلم کے۔ پختہ کاری سے قطع نظر ہو تو ہمارے طالبات نے رنگین اشعار کی شرح میں مرزا کے جذبات تک کا نہایت کامیاب چربہ اتارا ہے، ہم جامعہ عثمانیہ کے اساتذہ کو ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں ۔

مولانا عبدالماجد دریابادی "صدق" بابت یکم جنوری سنہ ۳۹ء لکھنؤ

ولی دکھنی، اردو شاعری کے "باوا آدم" کے نام سے کون ناواقف ہے؟ مدت کی فراموشی کے بعد اُن کی یاد کوئی دو سال ہوئے، دکن میں تازہ ہوئی، خوب دھوم دھام سے اُن کی یادگار منائی گئی، اور اُن کی ذات کو موضوع فکر بنا کر خوب خوب طبع آزمائی کی گئی ۔ نذر ولی انھیں کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر جامعہ عثمانیہ کی چار گریجویٹ خاتونوں کے تبصروں کا مجموعہ ہے۔ ڈاکٹر زور کی تقریب چھوڑ کر ساری کتاب، نسوانی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ کل چار عنوانات ہیں، پہلا ولی کا تخیل ہے، دوسرا کلام ولی اور تصوف ۔ تیسرا، ولی کی معلومات و خصوصیات شاعری، اور چوتھا ولی کا فن شاعری، ہر ہر عنوان پر ایک ایک بانوئے محترم نے قلم اٹھا کر تبصرہ نویسی کا حق ادا کر دیا ہے اور ایک تازہ شہادت اس امر کی بہم پہنچا دی ہے کہ نور جہاں بیگم، جہاں آرا بیگم اور زیب النساء، کے مذاق شعر و ادب کی بابت جو روایات و حکایات مشہور ہیں، وہ محض افسانہ نہیں ۔ ولی کے تغزل کی تشریح میں قلم بہت آسانی سے پھسل سکتا تھا لیکن صحیح تربیت کا یہ ثمرہ ہے کہ یہاں بھی قلم نسوانی حجاب و حیا کی پابندیوں کے ساتھ خوب بچ بچ کر چلا ہے، بعض بعض فقرے ادبی حیثیت سے بھی خوب بے ساختہ زبان قلم پر آگئے ہیں مثلاً ص ۴۹ پر ایک شعر کی تعریف میں جس میں آفتاب (مہر) کو حسن محبوب کے مقابلہ میں پست دکھایا گیا ہے، یہ فقرہ:۔ "شعر کی خوبی میں مہر کے دو معنی لفظ نے چار چاند لگا دئے ہیں" یہ "مہر" اور "چرخ" کے ضلع میں "چار چاند" بہت خوب، بہت خوب !

میاں بشیر احمد بی، اے ۔ بیرسٹر ایٹ لا ۔ رسالہ ہمایوں بابت دسمبر سنہ ۳۸ء

یہ کتاب حضرت ولی اورنگ آبادی کی شاعری کے متعلق چار مبسوط مقالوں پر مشتمل ہے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے درجہ ام اے کی چار طالب علم لڑکیوں نے سپرد قلم کئے ہیں ۔ پہلا مضمون "ولی کا تخیل" لطیف النساء بیگم صاحبہ کا ہے ۔ یہ مضمون ۱۲ صفحات پر پھیلا ہوا ہے ۔ مضمون ہر طرح جامع اور تمام پہلوؤں کو حاوی ہے ۔ زبان بھی قابل تعریف ہے ۔

دوسرے مقالہ کا موضوع "کلام ولی اور تصوف" ہے۔ یہ نجم النساء بیگم صاحبہ نے لکھا ہے "ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری" پر نعیم النساء بیگم صاحبہ نے قلم اٹھایا ہے۔ چوتھا مضمون "ولی کا فن شاعری" جہاں بانو بیگم صاحبہ نے لکھا ہے۔ چاروں مضامین قابل تعریف اور پڑھنے کے قابل ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی مستحق مبارکباد ہے کہ اس کی طالبات بھی علمی اور ادبی تحقیق کے کام اس خوش اسلوبی سے کرسکتی ہیں۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ تعلیم یافتہ گھرانوں کی خواتین فخر کے ساتھ اس کا مطالعہ کریں۔ حجم ۲۴۶ صفحات، کاغذ دبیز، جلد نفیس۔ قیمت عہ/

روزنامہ مشیر دکن حیدرآباد دکن ۱۲ / مارچ ۱۹۳۸ء

"سچ پوچھو تو آج کل حیدرآباد دکن میں جو کچھ بھی علم و ادب کے چرچے ہیں وہ بہت کچھ ادارۂ ادبیات اردو کے پرجوش ارکین کی سرگرمیوں اور ادبی خدمت گذاری کے ولولوں کی رہین منت ہیں جس کے روح رواں ملک کے بلند پایہ ادیب ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم اے، پی ایچ، ڈی (لندن) پروفیسر ادبیات اردو جامعہ عثمانیہ ہیں اور جن کے قوت اور بل پر ادارہ مذکور کی پوری مشنری کام کر رہی ہے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر عثمانین کی قلمی کاوشوں کو الگ کر لیا جائے تو حیدرآباد کی علمی فضا یکسر خاموش دکھائی دے گی۔

یہ کتاب ترتیب اور زیادہ سلیقے کے ساتھ پیش کی گئی ہے اس میں آدم ریختہ ولی اورنگ آبادی پر جامعہ عثمانیہ کی جماعت ایم اے کی چار نامور اور انشاپرداز طالبات کی تحقیقی و تنقیدی مبسوط مقالے درج ہیں جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہ کافی محنت اور مطالعہ سے لکھے گئے ہیں ولی کی شاعری کا اس قدر تفصیلی تجزیہ کیا گیا ہے کہ ولی سے متعلق اس سے پہلے ایسا مبسوط مضمون ہماری نظر سے نہیں گزرا ایک ایک عنوان پہ سیر حاصل بحثیں کی گئی ہیں یہ مضمون بہت محنت سے لکھا گیا ہے اور قابل تعریف ہے۔

دوسرے مضمون میں صوفیانہ کلام پر بہت ہی تجا بلانہ اور ماہرانہ انداز میں نظر ڈالی گئی ہے اور ایسے شعر پیش کئے گئے ہیں جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں تصوف کا ذوق رکھنے والوں کے لئے یہ بہت دلچسپی کی چیز ہے۔ تیسرا مضمون ولی کی علمی و ادبی معلومات اور خصوصیات شاعری ہے چوتھا اور آخری مضمون ولی کی فن شاعری پر ہے۔ یہ مضمون جو پچاس سے زاید صفحات میں آیا ہے بڑے معرکہ کا مضمون ہے اس میں شاعر کے کلام کی خوبیوں کو گنایا گیا ہے اور شرح و بسط کے ساتھ کمال شاعری پر نظر ڈالی گئی ہے۔ غرض نذر ولی ایک ایسا نفیس ادبی تحفہ ہے جس کا ہر شائق ادب کے پاس ہونا از بس ضروری ہے اس کتاب کی اشاعت کے لئے کارکنان ادارہ قابل مبارکباد ہیں۔"

DUE DATE